محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز
مخلص قاتل
اشتیاق احمد
Atlantis Publications
139

بلال سہیل

Atlantis Publications

تفریح بھی، تربیت بھی

اٹلانٹس پبلیکیشنز صحت مند، اصلاحی اور دلچسپ کہانیوں اور ناولوں کی کم قیمت اشاعت کے ذریعے ہر عمر کے لوگوں میں مطالعے اور کتب بینی کے فروغ کیلئے کوشاں ہے۔

ناول	مخلص قاتل
نمبر	انسپکٹر جمشید سیریز نمبر 139
پبلشر	فاروق احمد
قیمت	110 روپے

ISBN 978-969-601-051-7

ناول حاصل کرنے اور ہر قسم کی خط و کتابت اور رابطے کیلئے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

اٹلانٹس پبلیکیشنز
A-36 ... B-16 ... کراچی
0300-2472233, 32578273, 34268500
atlantis@cyber.net.pk
www.inspectorjamshedseries.com

ایک حدیث

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:
''اللہ تعالیٰ تمہاری شکل و صورت اور مال کو نہ
دیکھے گا،
بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو
دیکھے گا۔''

☆☆☆

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

☆ یہ وقت عبادت کا تو نہیں۔
☆ آپ کو اسکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔
☆ آپ نے کسی کو وقت تو دے نہیں رکھا۔
☆ آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے عبادت اور دوسرے کاموں سے فارغ ہولیں، پھر ناول پڑھیں۔
اشتیاق احمد

نئے قارئین کیلئے انسپکٹر جمشید سیریز کا ایک مختصر تعارف

انسپکٹر جمشید محکمہ سراغرسانی کے سب سے مشہور سراغرساں ہیں ..... انہیں جو کیس بھی دیا جاتا ہے وہ اسے حل کر کے چھوڑتے ہیں آج تک کوئی ایسا کیس نہیں ہے جو انہیں ملا ہو اور ان سے حل نہ ہو سکا ہو...... وہ مجرم کو عجیب و غریب طریقوں سے پکڑتے ہیں ...... اس طرح کہ مجرم کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ انسپکٹر جمشید کا گھیرا اس کے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہے ...... اسے تو بس اس وقت پتا چلتا ہے جب وہ اسکے خلاف تمام ثبوت حاصل کرنے کے بعد اس پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں ......

محکمہ سراغرسانی کے تمام آفیسر تو ان کا لوہا مانتے ہی ہیں ...... پولیس کے تمام شعبوں میں بھی ان کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے ...... اپنی ذاتی زندگی کے لحاظ سے وہ حد درجے ایمان دار ہیں ...... رشوت سے کوسوں دور بھاگتے ہیں ...... غریبوں کے بہت ہمدرد ہیں...... قانونی معاملات میں بہت سخت ہیں ...... جب کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت ہو جاتا ہے تو پھر اس کے ساتھ نرمی نہیں کرتے ......بڑی سے بڑی سفارش کی بھی پروا نہیں کرتے ...... جب کسی بات پر اڑ جاتے تو پھر اس سے پیچھے نہیں ہٹتے......

ان کے تین بچے ہیں سب سے بڑے کا نام محمود احمد ہے ...... جو ہائی اسکول میں پڑھ رہا ہے .... یہ بے حد ذہین اور پھرتیلا ہے، مشکل اوقات میں بالکل نہیں گھبراتا، کوئی مصیبت آپڑے تو ڈٹ جاتا ہے، اکثر اوقات اپنے والد کی مدد کرتا رہتا ہے ......

ان کے دوسرے بیٹے کا نام فاروق احمد ہے ...... فاروق بہت چلبلا اور کھلنڈرا ہے ...... اس پر شرارت کا بھوت ہر وقت سوار رہتا ہے...... بات بات پر لطیفے چھوڑنا،

ہر وقت دوسروں کو ہنسنے اور مسکرانے پر مجبور کردینا اس کی خاص عادت ہے ...... خود بھی مسکراتا رہتا ہے...... طبیعت میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے یہ بھی مشکل اوقات میں بھی نہیں گھبراتا...... درختوں پر چڑھنا اس کا محبوب مشغلہ ہے ......

فرزانہ فاروق سے ایک سال چھوٹی ہے ، ذہین ، بلا کی ترکیبیں سوچنے میں ماہر ، انسپکٹر جمشید کو مصیبت میں دیکھ کر حد درجے فکر مند ہوجاتی ہے ......

باپ کی صحبت میں رہ کر انہیں بھی جاسوسی کاموں سے ایک خاص قسم کا لگاؤ پیدا ہوگیا ہے ...... جونہی انہیں کوئی کیس حل کرنے کے لئے ملتا ہے، وہ بھی اس میں دلچسپی لینے لگتے ہیں...... اس کی ایک ایک تفصیل ذہن نشین کرلیتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کسی طرح وہ اپنے والد کی مدد کے بغیر ہی اس معاملے کی تہہ تک پہنچ جائیں ...... بلکہ تینوں آپس میں بھی ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فاروق البتہ بظاہر ایسے کاموں سے جی چراتا ہے......لیکن جب کیس میں دلچسپی لیتا ہے تو پھر ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔

ان کی والدہ بیگم جمشید جاسوسی بکھیڑوں اور جھنجھٹوں سے بالکل آزاد ہیں ، انہیں ان کاموں سے اُلجھن ہوتی ہے ......لہٰذا وہ کیس کے بارے میں کوئی تفصیل جاننے کی کوشش نہیں کرتیں...... ہاں اتفاق سے کسی معاملے میں اُلجھ جائیں تو پھر حالات کے سامنے ڈٹ جاتی ہیں۔

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کے سنسنی خیز جاسوسی اور سراغرسانی کے کارناموں پر مشتمل ناولوں کا یہ سلسلہ بچوں اور بڑوں میں دیوانگی کی حد تک مقبول ہے۔ انٹیلی جنس بیورو یعنی محکمہ سراغرسانی کے لائق ترین آفیسر انسپکٹر جمشید اور ان کے تین بچوں محمود، فاروق اور فرزانہ کے ایڈونچرز کے اس دلچسپ سلسلے کے اب تک آٹھ سو ناول شائع ہو چکے ہیں اور ہر ماہ اس میں ایک نئے ناول کا اضافہ ہوتا ہے۔ ایک سلسلے کے ہونے کے باوجود اس سیریز کا ہر ناول اپنی جگہ ایک مکمل ناول ہے۔ ہر ناول ایک نئی کہانی لئے ہوتا ہے اور وہ کہانی ایک ہی ناول میں انجام پذیر ہوجاتی ہے۔ لہٰذا آپ کوئی بھی ناول اٹھا کر پڑھنا شروع کر سکتے

ہیں اس خدشے کے بغیر کہ یہ سیریز کا کوئی درمیانی حصہ ہے۔ ہر ناول ایک علیحدہ اور مکمل کہانی ہے۔

انسپکٹر جمشید سیریز کے تمام ناول ہر لحاظ سے صاف ستھرے اور ہماری معاشرتی روایات کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ انسپکٹر جمشید کا گھرانہ ہمارے اور آپ کے گھروں کی طرح ایک سیدھا سادا گھرانہ ہے ۔تینوں بچے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔انسپکٹر جمشید جب اپنے آفس سے شام پانچ بجے گھر پہنچتے ہیں تو شکیلہ بیگم یعنی بیگم جمشید چائے کی ٹرے کے ساتھ ان کی منتظر ہوتی ہیں۔ فرزانہ گھریلو کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہے لیکن مہم جوئی اور سراغرسانی کے کارناموں میں اپنے دونوں بھائیوں کے ہم پلہ ہوتی ہے۔ انسپکٹر جمشید عام طور پر اپنے ذہین بچوں سے ہر نئے کیس کا نہ صرف ذکر کرتے ہیں بلکہ ان کی رائے بھی بغور سنتے ہیں اور اکثر ان کو عملی طور پر اپنی مہمات میں شامل کر لیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جہاں وہ شامل نہ بھی کریں وہاں یہ ٹوہ لگا کر خود ہی شامل ہوجاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کئی مرتبہ وہ مشکوک لوگوں اور جرائم کو بھانپ کر پہلے اپنے طور پر کسی معاملے میں کود پڑتے ہیں اور بعد میں اپنے والد کی مدد حاصل کرتے ہیں۔ دفتر میں انسپکٹر جمشید کا اسسٹنٹ سب انسپکٹر اکرام مجرموں کے بارے میں معلومات کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ کیس سے متعلق درکار معلومات انسپکٹر جمشید کو فراہم کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ انسپکٹر جمشید کا اپنی جان سے زیادہ خیال رکھتا ہے۔ محکمے میں چند افسران ایسے بھی ہیں جو انسپکٹر جمشید کی بے پناہ صلاحیت اور ان کی کامیابیوں کی شہرت سے جلتے ہیں ان میں انسپکٹر فاضل سرفہرست ہے جو ہمیشہ افسران بالا کے کان ان کے خلاف بھرتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی سازشوں میں کبھی کامیاب نہیں ہو پاتا۔ انسپکٹر جمشید کے اعلیٰ افسران آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی شیخ نثار احمد انسپکٹر جمشید کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے ہیں البتہ کبھی کبھی سیاسی دباؤ کی وجہ سے انہیں ناخواستہ انسپکٹر جمشید کو معطل بلکہ برخواست بھی کرنا پڑا ہے۔خان رحمان اور پروفیسر داؤد صاحبان ان کے بہت

پرانے دوست ہیں اور ہر اہم معاملے میں مدد کیلئے ان کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ خان رحمان کے دونوں بیٹے حامد اور سرور اور بیٹی ناز بھی کچھ مہمات میں انسپکٹر جمشید پارٹی کے ساتھ شامل رہے ہیں۔ ان کا ملازم ظہور خانساماں بھی ہے اور گھر کے باقی کام کاج بھی کرتا ہے اور اس اپنی میں کبھی سوٹ جلا بیٹھتا ہے تو کبھی ہانڈی۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں خان رحمان کے گھر میں ایک عرصے سے ملازمت کر رہے ہیں۔ خان رحمان اکثر ہانڈی اور سوٹ جلانے کی پاداش میں ظہور کو کان پکڑوا کر مرغا بنادیتے ہیں۔ پروفیسر داؤد کی اکلوتی بیٹی شائستہ سے بھی محمود، فاروق اور فرزانہ کی خوب بنتی ہے۔

انسپکٹر جمشید پارٹی کے ساتھ بڑی اور بین الاقوامی سطح کی مہمات میں انسپکٹر کامران مرزا، منور علی خان اور ان کے بچے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ کبھی شروع سے اور کبھی کسی کیس کے درمیان اتفاقیہ کہیں اچانک ان کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ کامران مرزا اور منور علی خان آپس میں بہت پرانے دوست بھی ہیں۔ آصف کامران مرزا کے ایک اور پرانے ساتھی اور دوست محمود صاحب کا بیٹا ہے۔ آصف کے والد کاروبار کے سلسلے میں بیرون ملک رہتے ہیں لیکن وہ تعلیم کے سلسلے میں اور کامران مرزا کے فرزند آفتاب کے ساتھ گہری دوستی کے سبب ان کے ہی گھر میں بچپن سے رہتا آیا ہے۔ فرحت، منور علی خان کی بیٹی ہے اور وہ بھی بچپن سے کامران مرزا کے گھر پر رہتی ہے۔ آفتاب، آصف اور فرحت بچپن سے ہی سگے بہن بھائیوں کی طرح رہتے آئے ہیں۔ فرحت بھی فرزانہ کی طرح ترکیبیں بتانے کی ماہر ہے۔ جب کبھی یہ سب کسی مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں یا کسی سازش کے جال میں بری طرح پھنس جاتے ہیں، فرزانہ اور فرحت کی ترکیبوں کے سبب ہی نکل پاتے ہیں۔

ان کی زندگی اسی طرح گزر رہی ہے اور یہ ایک بہت ہی دلچسپ زندگی ہے۔

☆☆☆☆☆

السلام علیکم!

اس بار کا ناول خالص جاسوسی اور تفتیشی ناول ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ اسے پڑھ کر آپ کو بس مزا آجائے گا تو یہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات ہوگی، لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ناول پڑھ کر آپ کو خاک بھی مزا نہیں آئے گا، لہٰذا مزا آنے یا نہ آنے کا معاملہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ذاتی طور پر مجھے اسی قسم کے ناول پسند ہیں۔ جب میں کوئی اس قسم کا ناول پڑھتا ہوں تو بہت لطف ہوں اور اس بار تو لکھنے میں بھی لطف آیا ہے۔

آپ کو بھی لطف اندوز ہونے کا نسخہ بتاتا ہوں۔ وہ بھی بالکل مفت۔ جب انسپکٹر جمشید اپنا بیان شروع کرنے لگیں، اس سے پہلے ناول بند کر کے یہ سوچئے کہ مجرم کون ہے اور اس نے یہ جرم کیوں کیا ہے۔ نتیجہ نکالنے کے بعد ایک کاغذ پر نوٹ کر لیجیے۔ یہ مقابلہ پورے گھر میں آپس میں کیا جاسکتا ہے اور پھر آپ کو معلوم ہوجائے گا، آپ کتنے ذہین ہیں۔ یہ ناول جاسوسی، ایمانداری کا نمونہ ہے۔

وہم کا شکار

'' دیکھو بھئی، تم ہمیں ساتھ نہ لے جاؤ، ورنہ وہاں کوئی نہ کوئی چکر چل جائے گا۔'' محمود نے اپنے دوست عرفان راؤ کو سمجھایا۔

'' چکر کس طرح چل جائے گا، وہاں ایسی کوئی بات سرے سے ہے ہی نہیں۔'' عرفان راؤ نے ہنس کر کہا۔

'' محمود ٹھیک کہہ رہا ہے راؤ۔ تم ، ہمیں نہیں جانتے۔ بس یوں سمجھ لو، ہم بہت سبز قدم واقع ہوئے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں، کوئی نہ کوئی گل وہاں ضرور کھل جاتا ہے۔ سبز قدم کا مطلب سمجھتے ہو نا۔'' فاروق بولا۔

'' ہاں سمجھتا ہوں۔ منحوس ہے اس کا مطلب، لیکن میں تم دونوں کو ہرگز ہرگز منحوس سمجھنے پر تیار نہیں۔''

'' تو کیا عرفان بھائی، میں منحوس ہوں۔'' فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

'' ارے نہیں فرزانہ بہن، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں سمجھا، محمود اور فاروق صرف اپنے آپ کو سبز قدم کہہ رہے ہیں۔''

'' نہیں بھئی، ہم جو بات بھی کہتے ہیں، تینوں کے لیے ہوتی

ہے۔'' محمود مسکرایا۔

''خیر، میں تو تمہیں لے کر ہی جاؤں گا۔ میں بھی تو دیکھوں کیسے چل جاتا ہے چکر۔''

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ انداز انسپکٹر جمشید کا تھا۔ محمود فوراً اٹھا اور دروازے کی طرف چلا گیا، پھر انہوں نے اس کی چہکتی آواز سنی۔

''ارے انکل، آپ بھی ہیں۔ بھئی واہ۔''

انہوں نے دیکھا، خان رحمان بھی ان کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ ان کے چہرے کھل اٹھے۔

''السلام علیکم انکل۔'' وہ ایک ساتھ بولے۔

''وعلیکم السلام۔ کیا بات ہے بھئی، ابھی تک میز پر چائے نہیں لگی۔'' خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

''جی بس ابھی لگ جاتی ہے، آج امی جان کے سر میں ذرا درد تھا، اس لیے وہ کچھ لیٹ ہو گئی ہیں۔ محمود نے انہیں بتایا۔

''اتنی بھی لیٹ نہیں ہوں۔'' انہوں نے بیگم جمشید کی آواز سنی۔ سب نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی چلی آ رہی تھیں۔

''اوہو بھئی، یہ کون صاحب ہیں۔ پہلے تو ہمیں ان سے ملنا چاہیے۔'' انسپکٹر جمشید کی نظر عرفان راؤ پر پڑی۔

''ابا جان، یہ ہمارے کلاس فیلو عرفان راؤ گھوگی ہیں۔ ایاز راؤ گھوگی کے بیٹے۔ شاید آپ نے ان کا نام سنا ہوگا۔''

''ارے، وہ تو میرے بہت اچھے واقف ہیں۔'' انسپکٹر جمشید کی بجائے خان رحمان چہک کر بولے۔

''میں نے بھی ان کا نام سنا ہے۔ بہت بڑے ٹھیکدار ہیں اور ان کی بنائی ہوئی ہر چیز پائیدار ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ نہایت ایمان دار واقع ہوئے ہیں۔ بے ایمانی کرنا نہیں جانتے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''آپ ٹھیک سمجھے، یہ انہی کے بیٹے ہیں۔ ان کے والد نے ایک پرانی حویلی خریدی ہے۔ کل ان لوگوں کا اس حویلی میں پہلا دن ہے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کو دعوت دے رکھی ہے، لہٰذا یہ ہمیں بھی دعوت دینے آئے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہم بھی دعوت میں شریک ہوں، جب کہ ہم وہاں جانا نہیں چاہتے۔'' محمود نے انہیں بتایا۔

''کیوں جانا کیوں نہیں چاہتے؟'' خان رحمان نے حیران ہو کر کہا، جبکہ انسپکٹر جمشید کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ جان گئے تھے کہ وہ دعوت میں کیوں شریک نہیں ہونا چاہتے۔

''بات دراصل یہ ہے انکل، آپ تو جانتے ہی ہیں، ہم جہاں بھی جاتے ہیں، وہاں کوئی نہ کوئی چکر چل جاتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کل اس حویلی میں بھی کوئی چکر چل جائے۔''

''بھئی اب یہ ضروری بھی نہیں۔'' خان رحمان ہنسے۔

''ہمارے خیال میں تو یہ بہت ضروری ہوکر رہ گیا ہے انکل۔''

''ویسے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایاز صاحب کو کوئی پرانی حویلی خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ آج رجحان یہ ہے کہ لوگ پرانے طرز تعمیر سے گھبرا کر نئے نئے مکان تعمیر کرا رہے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اب میں بتاتا ہوں، ابا جان کو پرانی چیزیں بہت پسند ہیں۔ پُرسکون ماحول پسند کرتے ہیں۔ وہ حویلی بہت پرانی ہونے کے ساتھ ساتھ شہر سے ذرا ہٹ کر بھی ہے۔ مل بھی بہت سستی گئی ہے، بس ابا جان کو پسند آ گئی اور انہوں نے خرید لی۔''

''ہوں۔ بھئی محمود، فاروق اور فرزانہ، میرا خیال ہے، تم وہم کا شکار ہوکر رہ گئے ہو۔ میں تمہیں بھی مشورہ دوں گا کہ کل دعوت میں شریک ہوکر اس وہم کو ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن سے جھٹک دو۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جھٹک تو جب دیں گے نا، جب وہاں کوئی واقعہ نہیں ہوگا۔''

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ دعوت میں شرکت ضرور کرو۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اچھی بات ہے۔ لو بھئی عرفان، ہم آ جائیں گے۔''

''دعوت کا وقت چار بجے شام ہے، لیکن تم لوگ تین بجے ہی آ جاؤ گے۔ میں تمہیں پوری حویلی دکھاؤں گا۔''

''اچھا، آ جائیں گے۔'' محمود بولا۔

اس وقت تک چائے کا دور شروع ہو چکا تھا۔

''انکل، آپ بھی آئیے نا۔'' عرفان کو جیسے اچانک خیال آیا۔

''بھئی، بغیر دعوت کے ہم کہیں جانا پسند نہیں کرتے اور تم ہمیں بس یوں ہی اخلاقاً پوچھ رہے ہو۔'' خان رحمان بولے۔

''جی نہیں، اخلاقاً نہیں۔ آپ ضرور تشریف لائیں۔''

''کیا خیال ہے جمشید، چلتے ہو؟''

''میں تو کل بہت مصروف ہوں۔ دفتر میں ایک میٹنگ ہے پھر بھی بہت دیر سے پہنچوں گا۔'' انہوں نے کہا۔

''اچھا بھئی، تو پھر میں ان تینوں کے ساتھ ہی آ جاؤں گا۔''

''پھر تو اور بھی لطف رہے گا۔'' فرزانہ خوش ہوکر بولی۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ ٹھیک تین بجے حویلی کے سامنے پہنچ گئے۔ حویلی شہر سے کافی دور واقع تھی۔ دور سے بہت پُر اسرار سی دکھائی دی۔ نزدیک پہنچے تو انہیں احساس ہوا، وہ کچھ زیادہ ہی پرانی ہے۔ دروازے پر دو ملازم کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے انہیں اندر پہنچایا۔ عرفان نے لپک کر ان کا استقبال کیا۔ ادھر ایاز راؤ گھوگی خان رحمان کو دیکھ کر چونکے۔

''اوہو، یہ تو خان رحمان ہیں، میرے اچھے دوست۔''

''انہیں میں نے دعوت دی ہے ابا جان۔ اور ان سے ملیے، یہ محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔ انسپکٹر جمشید ان کے والد کا نام ہے۔''

''اوہ۔'' ایاز راؤ کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا پھر انہوں نے محمود اور فاروق سے ہاتھ ملایا۔

''ابھی پارٹی شروع ہونے میں دیر ہے۔ آؤ بھئی، میں تمہیں حویلی کی سیر کرادوں۔'' عرفان بولا۔

''انکل، آپ چلیں گے ہمارے ساتھ۔''

''نہیں بھئی، میں تو ذرا ایاز صاحب سے گپ شپ کراؤں گا۔ تم دیکھ آؤ حویلی۔'' انہوں نے کہا۔

اور وہ عرفان کے ساتھ حویلی کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔ بڑے بڑے ستونوں پر کھڑی ہوئی یہ ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ نچلی منزل میں دس کمرے تھے۔ درمیانی منزل پر پانچ اور اوپر والی منزل پر صرف ایک کمرہ تھا اور باقی جگہ پر چھت تھی۔ نیچے ایک کھلا صحن تھا۔ درمیان والی منزل میں صحن کی جگہ پر جنگلا لگا تھا۔ اسی طرح ایک جنگلا چھت پر تھا۔ حویلی کے تین طرف چھ فٹ چوڑا باغ تھا۔ اس میں کسی زمانے میں درخت اور پودے لہلہاتے رہے ہوں گے۔ اب سوکھے پودے اور سوکھے درخت نظر آتے تھے۔ حویلی کے اندر تو ایاز راؤ نے رنگ روغن وغیرہ کرالیا تھا، لیکن اتنی جلدی باغ میں درخت اور پودے نہیں لگ سکے تھے۔ باغ کی سیر کرتے ہوئے عرفان نے انہیں بتایا:

''اباجان نے پانچ سو پھولوں کے پودوں اور پچاس درختوں کے پودوں کا آرڈر دیا ہے۔ چند دنوں میں نرسری والے آکر کام شروع کردیں گے۔''

''پھر تو یہ دعوت اس وقت ہونی چاہیے۔'' فرزانہ بولی۔

''دراصل یہ دعوت ایک قسم کی افتتاحی دعوت ہے۔ جب حویلی پوری طرح سج دھج جائے گی تو اباجان ایک شاندار دعوت دیں گے اور اس دعوت میں بھی تمہیں آنا ہوگا۔''

''دیکھا جائے گا۔'' محمود بولا۔

باغ کا چکر لگاتے ہوئے وہ حویلی کے پچھلی سمت میں آگئے۔ یہاں کچھ مزدور کام کرتے دکھائی دیے۔ نزدیک پہنچنے پر انہوں نے دیکھا، وہ ایک کنوئیں سے ملبہ اور اینٹیں وغیرہ نکال رہے تھے۔

''یہ کیا ہے؟''

''کنواں، کسی زمانے میں اس کنویں سے پانی نکالا جاتا ہوگا، پھر اسے پاٹ دیا گیا ہوگا۔ ابا جان نے اس کنویں کو دیکھا تو اس کی صفائی کرانے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کا خیال ہے، وہ اس کنویں کو ٹیوب ویل میں تبدیل کردیں گے۔ کیونکہ انہوں نے آس پاس کی زمینیں بھی خریدی ہیں۔ ان زمینوں پر کھیتی باڑی کرنے کا ارادہ ہے ان کا۔''

''بہت اچھا پروگرام ہے۔ ایک نیا کنواں کھدوانے کی نسبت اس کنویں کی صفائی آسان رہے گی۔''

مزدوروں نے انہیں دیکھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ان میں سے چار کنویں کے اندر تھے اور چار باہر۔ اندر والے تسلوں میں مٹی بھر بھر کر باہر والوں کو پکڑا رہے تھے اور وہ مٹی کو حویلی کی بیرونی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ڈھیر کرتے جا رہے تھے۔

وہ آگے بڑھ گئے۔ اور صدر دروازے سے پھر حویلی میں داخل ہو گئے۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ عرفان انہیں خان رحمان کے پاس چھوڑ کر خود کوئی کام کرنے چلا گیا۔

''کیوں بھئی، کیا رہا؟'' خان رحمان مسکرائے۔

''جی، کس سلسلے میں انکل۔'' فرزانہ حیران ہو کر بولی۔

''وہی چکر وکر چلنے کے سلسلے میں، امکانات ہیں یا نہیں۔''

''جی نہیں، ہر طرف سکون ہی سکون ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اس بار چکر نہیں چلے گا۔''

''چلو اچھا ہے، اطمینان سے دعوت اڑائیں گے۔'' خان رحمان خوش ہو کر بولے۔

''ٹھیک چار بجے دعوت شروع ہوئی۔ یہ ایک ہلکی پھلکی سی دعوت تھی۔ پہلے قرآن خوانی کرائی گئی۔ اس کے بعد چائے، مٹھائیاں، شامی کباب اور سموسے مہمانوں کے آگے رکھے گئے۔ ابھی یہ پوری طرح کھا بھی نہیں پائے تھے کہ ایک لہراتی ہوئی چیخ ان کے کانوں میں گھستی چلی گئی۔

سب کے سب چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ چیخ کس کی تھی، یا وہ کس جگہ سے چیخا تھا، پھر دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی اور انہوں نے دیکھا، ایک مزدور بدحواسی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ بدن پر کپکپی طاری تھی۔ آتے ہی اس نے کہا:

''وہ، وہ، کنویں میں، وہ......'' وہ صرف ہکلا کر رہ گیا، جملہ مکمل نہ کر سکا۔

''کنویں میں وہ۔ کیا مطلب؟'' فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

''آؤ دیکھیں۔'' محمود جلدی سے بولا اور پھر وہ تینوں باہر کی طرف دوڑے۔ خان رحمان ان کے پیچھے لپکے۔ عرفان اور اس کے والد ان کے پیچھے اور پھر باقی مہمان بھی لپک پڑے۔

کنویں کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے۔ ایک مزدور منڈیر کے پاس بے ہوش پڑا تھا۔ باقی چھ مزدور سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے دھواں دھواں سے لگ رہے تھے۔ تینوں نے کنویں میں جھانک کر دیکھا اور لرز کر رہ گئے۔

☆☆☆

دو سال پہلے

اتنے میں باقی لوگ بھی آ گئے۔ کنویں میں جھانکتے ہی ان میں سے اکثر چیخ پڑے۔ ملبے میں سے ایک ہاتھ ابھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک انسانی ہاتھ۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ کنویں میں کوئی شخص دفن کیا گیا تھا، گویا وہ قدرتی موت نہیں مرا تھا۔ اگر قدرتی موت مرتا تو اس کی باقاعدہ قبر بنائی جاتی۔

''اف خدا، یہاں تو شاید کسی کی لاش موجود ہے۔'' انہوں نے اپنے پیچھے خان رحمان کی آواز سنی۔

''ہاں انکل، بالکل یہی بات ہے۔''

''یا اللہ رحم۔ حویلی میں لاش کا کیا کام۔'' ایاز راؤ نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

''چلو بھئی ملبہ ہٹاؤ، دیکھیں تو سہی، یہ لاش کسی مرد کی ہے یا عورت کی اور موت کس طرح واقع ہوئی۔'' محمود نے مزدور سے کہا۔

''ہم۔ ہم یہ کام نہیں کریں گے۔ لاش کی روح ہمیں چمٹ جائے

گی۔''

''کیا فضول بات ہے، کچھ نہیں ہوگا۔ جلدی ہٹاؤ ملبہ۔'' خان رحمان بولے۔

چار مزدور تھر تھر کانپتے پھر کنویں میں اتر گئے اور ملبہ تسلوں میں بھر بھر کر باہر پکڑانے لگے۔ محمود اور فاروق بے ہوش مزدور کو ہلا جلا کر ہوش میں لے آئے۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھا۔

''وہ۔ وہ۔ کنویں میں۔''

''ہاں، ہم جانتے ہیں۔ کنویں میں ایک انسانی لاش موجود ہے، گھبراؤ نہیں۔'' محمود نے اسے دلاسا دیا۔

پانچ منٹ بعد وہ لاش کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ایک عورت کا چہرہ تھا۔ ہڈیوں پر کھال ہی چپٹی ہوئی تھی۔ گوشت گل سڑ چکا تھا۔ باقی جسم کے آس پاس سے ملبہ ہٹانے میں آدھ گھنٹا لگا۔ عورت کو کپڑوں سمیت دفن کیا گیا تھا۔ نچلا دھڑ اب ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ بغور دیکھنے پر انہیں اس کے سینے میں ایک سوراخ نظر آ گیا۔ اس جگہ سے لباس میں بھی سوراخ تھا اور سوراخ کے آس پاس کپڑے سخت سے تھے، گویا خون اس جگہ لگا تھا۔

''ارے باپ رے۔ اس عورت کو تو قتل کیا گیا تھا۔'' فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

''قتل، قتل۔'' کی خوف زدہ آوازیں ابھریں۔

اور کیا تمہارے خیال میں اس کے قدرتی موت مرنے کے بعد اسے کنویں میں پھینک دیا گیا تھا۔'' فرزانہ جل بھن کر بولی۔

''تو اس میں جلنے کی کیا ضرورت ہے۔'' فاروق بھنا کر بولا۔

''جلتی ہے میری جوتی۔ سنو، اس لاش کے جسم میں سے گولی تم نکالو گے۔'' فرزانہ نے تلملا کر کہا۔

''کیا کہا۔ گولی۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔'' فاروق بوکھلا اٹھا۔

''کیوں، کیا تمہارے خیال میں گولی جسم کے اندر نہیں ہو سکتی۔ دیکھ نہیں رہے، اس کی کمر پر کوئی سوراخ نہیں ہے، گویا گولی اندر ہی رہ گئی تھی، شاید وہ کسی ہڈی سے ٹکرا گئی ہوگی یا پھر چھوٹے سے پستول کی گولی رہی ہوگی۔'' فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

''بات تو ٹھیک ہے۔ یار فاروق، اب یہ کام کر ہی ڈالو۔ لاش زیادہ سے زیادہ ایک سال پرانی ہوگی، لہٰذا ہمیں اس کے قاتل کا سراغ بھی لگانا پڑے گا۔'' محمود نے کہا۔

''یہ کیا مشکل ہے۔ حویلی کے سابقہ مالک کے علاوہ کون قاتل ہو سکتا ہے۔'' فرزانہ فوراً بولی۔

''سابقہ مالک۔'' ایاز راؤ گھوگی کی آواز نے انہیں چونکنے پر مجبور کر دیا، کیوں کہ انہوں نے بھی یہ الفاظ چونک کر کہے تھے۔

''جی ہاں، سابقہ مالک۔ آپ نے یہ حویلی کس سے خریدی ہے۔''

''سردار تیمور سے۔ وہ میرے بہت اچھے دوست ہیں، لیکن وہ قاتل نہیں ہو سکتے۔ ان کے لہجے میں لرزش تھی۔

''اور یہ حویلی ان کے پاس کب سے تھی۔'' محمود نے پوچھا۔

''تقریباً تیس سال پہلے انہوں نے اسے ایک غیر ملکی سے خریدا تھا۔ اب خدا جانے غیر ملکی نے اسے کس سے خریدا تھا۔'' ایاز راؤ بولے۔

''خیر، ہمیں اتنا پیچھے جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ لاش اتنی پرانی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو سال پرانی ہوگی اور دو سال پہلے تک اس حویلی کے مالک آپ کے دوست سردار تیمور ہی تھے، لہٰذا ہمیں ان سے بات کرنا ہوگی، لیکن نہیں، اس سے پہلے تو یہاں پولیس کو آنا چاہیے۔ ماہرین کو آنا چاہیے اور ایک ڈاکٹر کو بھی، جو ہمیں یہ بتائے گا، لاش کتنی پرانی ہے۔ فاروق، تم نے ابھی تک گولی نہیں نکالی۔''

''بھئی، اب اس لاش کا پوسٹ مارٹم تو کرانا ہی ہوگا۔ پوسٹ مارٹم والے خود ہی نکالتے رہیں گے، اب میں گولی کہاں تلاش کروں۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''بے وقوف ہو تم۔ اب اندر صرف ہڈیاں ہی رہ گئی ہیں۔''

''پھر بھی میں گولی ہاتھ سے تلاش نہیں کروں گا۔''

''اچھا خیر جانے دو۔'' محمود نے تنگ آ کر کہا اور فون کرنے حویلی کے اندر چلا گیا۔ باقی مہمان اب ایک ایک دو دو کرکے رخصت ہونا

شروع ہوگئے۔ ایاز راؤ نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ فاروق اور فرزانہ اب لاش کا جائزہ لے رہے تھے۔ اچانک فاروق کی نظر دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی پر پڑی۔ انگلی میں سونے کی ایک انگوٹھی موجود تھی۔

''حیرت ہے، قاتل نے سونے کی انگوٹھی تک اتارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' وہ بڑبڑایا۔

''شاید اس پر خوف بُری طرح سوار تھا یا وہ بہت جلدی میں تھا۔'' فرزانہ بولی۔

فاروق نے انگوٹھی انگلی سے نکال لی۔ اس پر مٹی جمی تھی۔ ایک تنکے کی مدد سے مٹی ہٹائی تو انگریزی کے حروف این۔ او کندہ تھے۔

''این او'' فاروق بڑبڑایا۔'' کم از کم سردار تیمور این۔ او سے تو نہیں بنتا۔''

''تمہارا سر بنتا ہے، این۔ او سے۔'' فرزانہ جھلا اٹھی۔

''اگر میرا سر این او سے بنتا ہے تو تمہارا سر کس سے بنتا ہے؟''

فاروق نے اسے کھاجانے والی نظروں سے گھورا۔

''دیکھو بھئی، کہیں لڑ نہ پڑنا، میں یہاں موجود ہوں۔'' خان رحمان نے گویا انہیں خبردار کیا۔

''شکریہ انکل، آپ نے ہمیں بتادیا۔ ویسے انکل ذرا ذہن تو دوڑایئے، این۔ او سے کیا کیا نام بنتے ہیں؟''

''نا بھئی، میں نہیں دوڑاتا ذہن، کنویں میں گر پڑے گا۔''

خان رحمان ہنسے۔

''کیا گر پڑے گا انکل کنویں میں؟'' محمود نے قریب آتے ہوئے کہا۔ اس نے ان کے جملے کا آخری حصہ سن لیا تھا۔

''میرا ذہن، تم سناؤ کیا کر آئے ہو۔''

''ا! ہاں میٹنگ میں ہیں۔ انکل اکرام آرہے ہیں۔''

''اس کی انگلی سے یہ انگوٹھی ملی ہے۔ این۔ او کندہ ہے اس پر۔''

فاروق نے اسے بھی انگوٹھی دکھادی۔

''ہوں تو اس عورت کے نام کے ابتدائی حروف این۔ او ہیں چلو ایک سراغ تو ملا۔''

انہوں نے لاش کا ایک بار پھر غور سے مشاہدہ کیا۔ اس کے بال سنہری تھے۔ شاید رنگ روپ بھی سفید رہا ہوگا۔ جسم پر کپڑے حد درجے قیمتی معلوم ہورہے تھے۔ اگرچہ مٹی نے اب انہیں تہس نہس کردیا تھا۔

''میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے۔ کیوں نہ ہم......'' محمود کہتے کہتے رک گیا، پھر حیران ہوکر ایاز راؤ کی طرف دیکھنے لگا۔

''تمہاری سمجھ میں ایک بات آتی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ کیوں نہ ہم۔ بس اس کے بعد تمہارے ذہن میں سرے سے کوئی بات نہیں آتی۔ یار صاف کیوں نہیں کہتے، تمہارا ذہن بالکل ناکارہ ہوکر رہ گیا ہے۔''

''راؤ صاحب، کیا آج کی دعوت میں آپ کے دوست سردار تیمور

نے شرکت نہیں کی؟'' محمود نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر کہا۔

''نہیں، وہ کل سے بخار میں مبتلا ہیں۔'' ایاز راؤ نے بتایا۔

''ہوں، ان کا پتا لکھوادیں۔'' محمود نے جیب سے نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔

''لکھ لیں۔ سولہ گرین لین اعظم روڈ۔'' انہوں نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' محمود نے نوٹ بک جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم وہ بات گول کر گئے، جو تمہاری سمجھ میں آ رہی تھی۔'' فاروق نے اسے ٹوکا۔

''ہاں، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم کیوں نہ فوری طور پر سردار تیمور سے جا کر مل لیں، اس سے پہلے کہ اسے حویلی کے کنویں سے لاش ملنے کی خبر ہو۔''

''بات حد درجے معقول ہے۔'' فرزانہ نے فوراً کہا۔

''اگر یہ اس حد تک معقول ہے، تو پھر یہاں کیوں کھڑے ہو۔ جا کر مل آؤ سردار تیمور سے۔''

''تو تم ہمارا ساتھ نہیں دو گے؟''

''ہم میں سے ایک آدمی کا یہاں موجود رہنا بھی ضروری ہے۔'' فاروق بولا۔

''ٹھیک ہے۔ تم یہاں ٹھہرو، ہم سردار تیمور کو ٹٹول آتے ہیں۔''

یہ کہہ کر محمود ایاز راؤ کی طرف مڑا۔

''مہربانی فرما کر اپنے دوست کو فون پر اس لاش کے بارے میں کوئی اطلاع نہ دیجیے گا۔ ہم ان سے ملنے جا رہے ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' ایاز راؤ نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

انہوں نے حویلی سے باہر جانے کے لیے قدم اٹھا دیے۔ اچانک ان کی نظر عرفان راؤ پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر غمگین انداز میں مسکرائے۔

''ہم نے کہا تھا نا عرفان، ہمیں نہ بلاؤ۔ کوئی نہ کوئی چکر چل جائے گا۔'' محمود بولا۔

''لیکن ابا جان تو کنویں کی صفائی پر ایک دن پہلے ہی آدمی لگا چکے تھے۔ تم لوگ نہ آتے، تب بھی یہ لاش ضرور برآمد ہوتی۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہوں خیر، اس صورت میں کم از کم ہم خود کو ذمے دار تو محسوس نہ کرتے۔ یعنی یہاں نہ آنے کی صورت میں۔''

''بھئی میں تم سے کوئی شکایت تو نہیں کر رہا۔'' عرفان مسکرایا۔

اور وہ آگے بڑھ گئے۔ اسی وقت اکرام اپنے عملے کے ساتھ آتا نظر آیا۔ انہیں دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔

''مجھے بلا کر کہاں چل دیے۔''

''تفتیش شروع کر چکے ہیں اور اسی سلسلے میں جا رہے ہیں۔ ایک شخص کو چیک کرنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں لاش ملنے کی خبر اس تک پہنچے

سے پہلے ہم بات کرلیں۔''

''لیکن یہاں کی صورت حال تو مجھے بتاتے جاؤ۔'' اکرام جلدی سے بولا۔

''یہاں کی صورت حال یہ ہے کہ یہ حویلی ہمارے دوست کے والد ایاز راؤ گھوگی نے خریدی ہے۔ آس پاس کی زمینیں بھی انہوں نے خریدی ہیں۔ اب زمینوں پر ان کا ارادہ کھیتی باڑی کرنے کا ہے۔ حویلی کی چاردیواری میں کسی زمانے میں ایک کنواں بھی تھا، ملبہ ڈال کر اسے بند کردیا گیا تھا۔ ایاز راؤ نے کل اس کنویں پر آٹھ مزدور لگائے تھے، تاکہ اس میں سے ملبہ نکال دیا جائے۔ آج ان کا حویلی میں پہلا دن تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کودعوت دی تھی۔ ہم بھی ان میں شامل تھے۔ دعوت شروع ہوئی تو ایک مزدور کی چیخ سنی گئی۔ معلوم ہوا، کنویں میں لاش ملبے میں دبی ہوئی ہے۔ ملبہ ہٹایا گیا تو ایک عورت کی لاش برآمد ہوئی۔ اس کی انگلی سے سونے کی ایک انگوٹھی بھی ملی ہے۔ اس انگوٹھی پر انگریزی کے حروف این۔ او کھدے ہوئے ہیں۔ ایاز راؤ نے حویلی اپنے ایک دوست سردار تیمور سے خریدی ہے اور سردار تیمور نے یہ حویلی تیس سال پہلے خریدی تھی۔لاش ایک یا دو سال پرانی معلوم ہوتی ہے، لہذا ہم سردار تیمور کو چیک کرنے جارہے ہیں۔'' محمود نے جلدی جلدی بتایا۔

''تو کیا اس عورت کوقتل کیا گیا ہے۔''

''جی ہاں، اس کے سینے پر گولی لگنے کا نشان موجود ہے۔ گولی بھی اس کے جسم میں ہی کہیں موجود ہے۔ پوسٹ مارٹم کے دوران مل جائے گی۔''

''اچھی بات ہے، تم فارغ ہوکر آؤ، میں یہیں ملوں گا۔''

''اور ڈاکٹر صاحب سے کہیے گا۔ صحیح صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کریں، اسے مرے کتنا عرصہ گزرا ہوگا۔ فاروق اندر ہی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ باہر نکل کر پہلے پیدل چلے، پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھے اور اعظم روڈ کی طرف روانہ ہوگئے۔

''ہاں فرزانہ کیا خیال ہے۔'' محمود بولا۔

''کس بارے میں؟''

''بھئی اس لاش کے بارے میں۔'' محمود نے جھلا کر کہا۔

''اچھی خاصی ہے۔ زندہ حالت میں اور بھی اچھی خاصی رہی ہوگی۔'' فرزانہ نے جواب دیا۔

''دھت تیرے کی۔'' محمود نے جھلا کر کہا، لیکن ران پر ہاتھ نہ مار سکا۔

''لو ران پر میں ہاتھ مار دیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر فرزانہ نے سچ مچ اس کی ران پر ہاتھ دے مارا۔

''کیا کررہی ہو، ہم گھر میں نہیں بیٹھے ہیں۔''

''اوہ، مجھے نہیں معلوم تھا۔''

''فاروق کی عدم موجودگی میں تم اس کا پارٹ کیوں ادا کرنے لگ جاتی ہو۔'' محمود نے منہ بنایا۔

''نہیں تو تمہیں وہم ہوا ہے۔ ہاں تو تم اس لاش کے بارے میں میری رائے پوچھ رہے تھے۔ تو سنو، اسے یقیناً قتل کیا گیا ہے۔ قاتل ایاز راؤ تو کسی صورت نہیں ہوسکتا، کیونکہ اگر وہ قاتل ہوتا تو کبھی اس کنویں کو خالی نہ کراتا۔ ہاں سردار تیمور ضرور قاتل ہوسکتا ہے، لیکن اس کا بھی امکان بہت کم ہے، کیونکہ اگر وہ قاتل ہوتا تو کبھی اس حویلی کو فروخت نہ کرتا اور اگر فروخت کرتا تو اس سے پہلے اس کنویں کا نام و نشان ضرور مٹا دیتا، تاکہ کوئی اسے کنویں کے طور پر استعمال کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکے۔ اور پھر سردار تیمور کو تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کے دوست ایاز راؤ نے آس پاس کی زمینیں بھی خریدی ہیں اور وہ ان پر کاشت کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ان حالات میں تو وہ ہرگز اس کنویں کو باقی نہیں چھوڑ سکتا تھا، جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے حویلی فروخت کردی اور کنویں کو بھی جوں کا توں رہنے دیا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سردار تیمور نے بھی اس عورت کو قتل نہیں کیا۔''

فرزانہ روانی کے عالم میں کہتی چلی گئی۔

''تمہارے دلائل وزنی ہیں، لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عورت کا قاتل کون ہے۔'' محمود بولا۔

''کوئی تو ضرور ہے۔ اس سوال سے پہلے ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ عورت تھی کون۔ ایک بار ہمیں یہ معلوم ہوجائے تو پھر تفتیش کا راستہ خود بخود کھل جائے گا۔'' فرزانہ بولی۔

''حیرت تو یہ ہے کہ اس عورت کے گم ہونے پر کسی کے کان پر جوں تک کیوں نہیں رینگی۔''

''یہ تو خیر نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے لواحقین نے اسے تلاش تو ضرور کیا ہوگا۔ اخبارات میں اس کی گمشدگی کی خبریں بھی شائع ہوئی ہوں گی اور جب عورت نہیں ملی ہوگی تو وہ صبر کرکے بیٹھ گئے ہوں گے۔''

''لو ہم اعظم روڈ پر پہنچ گئے۔ باتوں میں پتا ہی نہیں چلا۔'' محمود چونک کر بولا۔

گرین لین میں انہیں سولہ نمبر کی کوٹھی تلاش کرنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔ کوٹھی بالکل نئی تعمیر کی گئی تھی۔ رنگ و روغن کی بو ان کے نتھنوں میں آنے لگی۔ محمود نے آگے بڑھ کر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ جلد ہی ایک نوجوان ملازم کی صورت نظر آئی۔

''جی فرمایئے۔''

''سردار تیمور صاحب یہیں رہتے ہیں؟''

''جی ہاں، بالکل یہیں رہتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ہمیں ان سے ملنا ہے۔ ان سے کہیے، ہم ایاز راؤ صاحب کے

ہاں سے آئے ہیں۔"

"اوہو، ایاز صاحب تو ان کے دوست ہیں۔ آپ اندر تشریف لے آئیں۔ انہیں آج تیز بخار ہے، لیکن پھر بھی وہ آپ سے ملیں گے۔" یہ کہہ کر ملازم نے انہیں اندر داخل ہونے کے لیے راستہ دیا۔ ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اطلاع دینے چلا گیا، پھر واپس آ کر بولا۔

"چلیے، وہ اس وقت بستر میں ہیں۔ آپ کو وہیں بلا رہے ہیں۔"

"شکریہ۔"

محمود نے کہا اور اس کے پیچھے چلتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ بہت شان دار طریقے پر سجا ہوا تھا۔ بستر میں جو شخص لیٹا ہوا تھا، ادھیڑ عمر ہوتے ہوئے بھی بہت طاقت ور اور صحت مند دکھائی دیا، تاہم اس کا چہرہ بہت تمتمایا ہوا تھا۔ ملازم پہلے ہی دو کرسیاں ان کے بستر کے پاس رکھ چکا تھا۔ دونوں السلام علیکم کہتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"وعلیکم السلام، آپ لوگ ایاز راؤ کے ہاں سے آ رہے ہیں۔ وہاں تو آج دعوت تھی۔" وہ بولے۔

"جی ہاں، ہم بھی دعوت میں شریک تھے۔ ایاز صاحب سے معلوم ہوا، حویلی انہیں آپ نے فروخت کی ہے۔ آپ نے اتنی شان دار حویلی کیوں فروخت کر دی۔"

"میرا دل اچاٹ ہو گیا تھا، اس حویلی سے۔ اس کی دیواریں مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں۔" سردار تیمور بولے۔

"حویلی آپ کے پاس شاید تیس سال سے تھی؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"ہاں، تیس سال پہلے میں نے ایک غیر ملکی سے خریدا تھا۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"خیر تو ہے، آپ بہت غمگین ہیں۔ کہیں حویلی چھوڑنے کا ہی تو غم نہیں آپ کو۔" محمود نے انہیں بغور دیکھا۔

"ہاں، شاید یہی بات ہے۔ جب سے میں نے حویلی فروخت کی ہے، بہت غمگین رہنے لگا ہوں۔ کل جب ایاز راؤ نے فون پر بتایا کہ وہ حویلی میں اپنے دوستوں کو دعوت دے رہے ہیں اور اس میں مجھے بھی شریک ہونا ہوگا تو مجھے خوشی کی بجائے رنج کا احساس ہوا۔ یوں لگا، جیسے میں نے حویلی بیچ کر بہت بُرا کیا ہو اور اس کے تھوڑی دیر بعد مجھے بخار نے آ لیا اور میں آج اس دعوت میں شریک بھی نہیں ہو سکا۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کسی شدید صدمے کا عرصے سے شکار ہوں۔" فرزانہ نے ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ بتایئے، آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟"

"حویلی کے پچھلے حصے میں چار دیواری کے پاس جو کنواں ہے،

کاغذ کا ٹکڑا

وہ سکتے میں آ گئے۔ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس سیدھے سادے سوال کا ردِعمل اس قدر شدید ہوگا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے محمود نے کہا:

''خدا نہ کرے کہ آپ کا کوئی عزیز گم ہوا ہو اور اگر ایسا ہوا ہے تو شاید ہم آپ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لائے۔''

''خدایا رحم، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''یہ کہ اس کنویں سے ایک عورت کی لاش برآمد ہوئی ہے۔''

''نہیں۔'' سردار تیمور خوف زدہ آواز میں چلا اٹھے۔ ان کی آواز گونج کر رہ گئی۔ فوراً بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی دوڑ کر اندر آئی۔ پچیس سال کے قریب اس کی عمر رہی ہوگی۔

''کیا ہوا ڈیڈی۔ خیر تو ہے؟''

''نہیں بیٹی، خیر نہیں ہے۔ یہ لوگ ایک بہت بھیانک خبر لائے ہیں۔''

''بھیانک خبر تو ہم بہت پہلے سن چکے ہیں ڈیڈی۔ ممی کے گم ہونے کی خبر ہمارے لیے کچھ کم بھیانک تو نہیں۔'' لڑکی بولی۔

''لیکن یہ لوگ اس سے بھی خوف ناک خبر لائے ہیں فوزیہ۔ ان کا کہنا ہے کہ حویلی کے کنویں سے ایک عورت کی لاش ملی ہے۔''

''کنویں سے لاش، اللہ رحم کرے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لاش ممی کی ہوگی۔''

''تب پھر وہ کس کی ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے۔ ہمیں اسی وقت چل کر دیکھ لینا چاہیے۔'' سردار تیمور اٹھتے ہوئے بولے۔

''ہم بھی یہی کہنے والے تھے۔'' محمود جلدی سے بولا اور فوزیہ کی نظریں ان پر جم گئیں۔

''یہ۔ یہ کون لوگ ہیں؟''

''یہ تمہارے انکل کی دعوت میں شریک تھے۔ لاش ملنے پر مجھے اطلاع دینے چلے آئے۔''

''ان کے چہرے جانے پہچانے سے لگتے ہیں۔ شاید میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے۔ خیر، چلیے پہلے ہم لاش کو تو دیکھ آئیں۔''

''ٹھیک ہے چلو۔'' سردار تیمور بولے پھر ان کی طرف مڑے:

''آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟''

''ہمیں بھی واپس وہیں جانا ہے۔ ویسے آپ کی بیگم کا نام کیا ہے؟'' محمود نے کہا۔

''نازلی اورنگ۔''

''اور کیا وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی بھی پہنتی تھیں۔'' فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔''

''تب تو زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ وہ لاش آپ کی بیگم کی ہے۔ کیونکہ لاش کی انگلی سے سونے کی ایک انگوٹھی اتاری گئی ہے اور اس انگوٹھی پر انگریزی کے حروف این۔ او کھدے ہوئے ہیں۔''

''اف خدا، آپ لوگ تو ہمارے دل ہلائے دے رہے ہیں۔'' سردار تیمور نے کانپ کر کہا۔

''ہم۔ ہم کیا کرسکتے ہیں جناب۔'' فرزانہ بے چارگی کے انداز میں بولی۔

''لیکن یہ اورنگ کیا نام ہوا؟''

''میری بیوی ایک غیر ملکی کی بیٹی تھی۔ اپنے نام کے ساتھ وہ اپنے باپ کا نام لگاتی تھی۔ نازلی اس کا نام تھا اور اورنگ شا اس کے باپ کا نام تھا۔'' سردار تیمور نے باہر کی طرف چلتے ہوئے بتایا۔ اب چونکہ وہ کار تک پہنچ گئے تھے، لہٰذا محمود اور فرزانہ کو اپنے سوالات بند کرنا پڑے، حالانکہ ابھی بہت سے سوالات کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گئے۔

''معاملہ تو نزدیک ہی نکل آیا۔'' محمود دبی آواز میں بولا۔

''لیکن لگتا ہے الجھا ہوا۔''

''اگر اس نے ہمیں زیادہ الجھایا تو ہم ابا جان کو آواز دے لیں گے۔'' محمود نے مسکرا کر کہا۔

''کم ہمتی کی باتیں نہ کرو۔ وہ میٹنگ میں مصروف ہیں اور تم فاروق نہیں، محمود ہو۔''

''اس یاد دہانی کے لیے شکر گزار ہوں۔''

آخر کار وہ حویلی پہنچ گئے، پھر کار سے اتر کر اندر داخل ہوئے۔ سب لوگ ابھی تک کنویں کے گرد موجود تھے، البتہ خان رحمان جا چکے تھے۔ انہیں آتے دیکھ کر ایاز راؤ بولے:

''آؤ سردار، تم بھی آؤ۔ لیکن بھئی، تمہیں تو بخار تھا۔''

''ہاں، ان لوگوں سے معلوم ہوا کہ کنویں سے ایک لاش ملی ہے تو آنا ہی پڑا۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی ان کی اور ان کی بیٹی کی نظریں لاش پر چپک کر رہ گئیں۔

''یہ۔ یہ تمہاری امی ہی ہے فوزیہ۔ اس میں کوئی شک نہیں۔''

''ہاں ڈیڈی۔'' فوزیہ اپنے باپ سے لپٹ گئی اور دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کا رونا ان سے دیکھا نہ گیا۔ وہ وہاں سے دور ہٹ آئے۔

''ہاں بھئی، ہماری عدم موجودگی میں تم نے کیا تیر مارا؟''

''تیر کمان دے گئے تھے نا مجھے کہ تیر مارتا۔'' فاروق نے برا سا

منہ بنایا۔

''گویا تم کوئی اور بات معلوم نہیں کر سکے۔''

''جہاں تک میرا خیال ہے ایاز راؤ نے یہ کنواں جان بوجھ کر کھدوایا ہے۔'' فاروق نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''یہ تو سبھی کو معلوم ہے، انہوں نے کنواں جان بوجھ کر کھدوایا ہے۔'' فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

''تم اور کوئی کام کی بات معلوم کرلو، ہو ہی نہیں سکتا۔'' محمود بولا۔

''میرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاید ایاز راؤ کو شک تھا کہ اس کنویں سے کوئی لاش نکلے گی۔ اسی لیے انہوں نے یہاں مزدور لگائے تھے۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو۔'' فرزانہ نے اسے گھورا۔

''اس طرح کہ اس پوری دعوت میں ہماری عمروں کا کوئی اور مہمان نہیں تھا۔ آخر ہمیں کیوں بلوایا گیا ہے۔ میں نے اسی خیال کے تحت عرفان راؤ کو ٹٹولا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے ڈیڈی نے زور دے کر کہا تھا کہ وہ بھی اس دعوت میں اپنے کچھ دوستوں کو لائے اور انہیں یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ عرفان ہمیں اپنے سب سے گہرے دوست خیال کرتا ہے۔'' فاروق نے کہا۔

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ایاز راؤ یہ چاہتے تھے کہ ہماری موجودگی

میں لاش برآمد ہو، گویا انہیں یقین تھا کہ کنویں سے لاش ضرور برآمد ہوگی۔

''ہاں، میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔'' فاروق بولا۔

''لیکن کنویں پر مزدور تو انہوں نے کل لگائے تھے۔ لاش تو کل بھی برآمد ہوسکتی تھی، جب کہ دعوت آج دی گئی۔'' فرزانہ نے اعتراض کیا۔

''میں نے ایک مزدور سے سوالات کیے ہیں، اس کا کہنا ہے کہ انہیں کل شام لگایا گیا تھا، پھر تھوڑی دیر بعد ہی دوسرے دن کام پر آنے کی ہدایات دے دی گئیں۔''

''ہوں، پھر تو تم نے کچھ کام کیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایاز راؤ کو یہ بات کس طرح معلوم تھی کہ کنویں میں کوئی لاش موجود ہے۔ ان کا اس لاش سے کیا تعلق، اس لاش سے تعلق تو ان کے دوست سردار تیمور کا ثابت ہوا ہے، ہمارا یہ خیال غلط ہے۔ ایاز راؤ کو کنویں میں لاش موجود ہونے کے بارے کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ تو ایک اتفاق ہے کہ انہوں نے کنواں صاف کروانے کا پروگرام بنایا اور اس میں سے لاش نکل آئی۔ وہ بھی ان کے دوست کی بیوی کی۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اس راز کو حل کرنے کے لیے ہمیں ماضی میں جھانکنا ہوگا۔ جب سردار تیمور کی بیوی غائب ہوئی تھی۔'' فرزانہ جلدی جلدی کہتی چلی گئی۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ اب جب کہ ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ لاش

کسی زمانے میں سردار تیمور کی بیوی تھی تو ہم وہ تاریخ ان سے معلوم کرسکتے ہیں، جس تاریخ کو وہ گم ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہی ہماری تفتیش کی گاڑی آگے بڑھ سکتی ہے۔'' محمود نے فرزانہ سے اتفاق کیا۔

''تو پھر آؤ، کنویں کے پاس چلیں۔ ذرا دیکھیں تو سہی، اب وہاں کیا ہو رہا ہے۔'' فاروق بولا۔

وہ کنویں کے پاس پہنچے۔ سردار تیمور اور ان کی بیٹی فوزیہ کی سسکیاں ابھی تک گونج رہی تھیں۔ فاروق کا جی چاہا، سردار تیمور سے کہے:

''اب اگر آپ کا سسکیوں کا کوٹا پورا ہو چکا ہو تو آپ ذرا ایک طرف ہو کر ہمارے کچھ سوالات کے جواب دے دیں۔''

لیکن وہ یہ جملہ نہ کہہ سکا، بلکہ اس نے یوں کہا:

''سردار صاحب، ہم، میرا مطلب ہے، سردار تیمور صاحب، ہم جانتے ہیں، آپ پر غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ہم آپ کو صبر کرنے کا مشورہ دینے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ مشورہ قبول ہو تو ہمارے ساتھ حویلی میں تشریف لے چلیے۔ وہاں ہم آپ سے چند سوالات کرنا چاہتے ہیں۔''

''آپ۔ آپ۔ آخر آپ کون ہیں؟'' سردار تیمور نے اٹک اٹک کر حیرت زدہ انداز میں کہا۔

''ہم تینوں کے لیے الگ الگ آپ کا لفظ استعمال کرنے کی

ضرورت نہیں۔ ہمارے نام محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں اور ہم اس قتل کی تفتیش کریں گے۔''

''آپ تفتیش کریں گے؟''

''جی ہاں، یوں تو یہاں سب انسپکٹر اکرام بھی موجود ہیں۔ لیکن انہیں اس وقت ذرا دوسری قسم کی مصروفیات ہیں۔ مثلاً لاش کے فوٹو وغیرہ اتروانا، پھر لاش کو پوسٹ مارٹ کے لیے لے جانا وغیرہ وغیرہ۔''

''لیکن آپ کا پولیس سے کیا تعلق؟ کیا اب محکمہ پولیس نے نوعمر لڑکے اور لڑکیاں بھی ملازم رکھنے شروع کر دیے ہیں۔''

''جی نہیں۔ ہم اسپیشل ملازم ہیں، آیئے۔''

''بھئی سردار تیمور، بات دراصل یہ ہے کہ یہ تینوں انسپکٹر جمشید کے بچے ہیں۔'' ایاز راؤ نے تعارف کرایا۔

''اوہ۔'' سردار تیمور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، پھر وہ منہ سے کچھ کہے بغیر ان کے ساتھ چل پڑے۔ فوزیہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ وہ انہیں حویلی کے اندرونی حصے میں ایک کمرے میں لے آئے۔ بیٹھنے کے بعد محمود نے پہلا سوال کیا۔ ساتھ ہی اس نے جیب سے نوٹ بک نکال لی۔

''آپ کی بیگم نازلی اورنگ صاحبہ کس تاریخ کو اور کن حالات میں گم ہوئی تھیں؟''

''یہ آج سے دو سال پہلے کی بات ہے۔ ۶/جون کی رات کو وہ

گم ہوئی تھی۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوئی، کیونکہ وہ عام طور پر میرے بعد اٹھنے کی عادی تھی۔ میں نے پہلے تو اسے آوازیں دیں، پھر پوری حویلی میں دیکھا۔ فوزیہ نے بھی میری مدد کی۔ ملازم بھی ادھر ادھر دوڑے، لیکن اس کا سراغ کہیں نہیں ملا۔'' انہوں نے بتایا۔

''اس وقت آپ کے ہاں کتنے ملازم تھے؟'' فرزانہ بولی۔

''تین، ایک باورچی، ایک ڈرائیور اور ایک مالی۔ تینوں حویلی کے اندر ہی سویا کرتے تھے، کیونکہ ہم تین آدمی اتنی بڑی حویلی میں تنہائی سی محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے میں نے ملازموں کو حویلی ہی میں سلانا شروع کر دیا، اس سے پہلے وہ اپنے گھر جا کر سوتے تھے۔''

''آپ نے بتایا ہے کہ یہ کنواں اس غیر ملکی کے زمانے میں ہی ملبے سے پُر تھا۔ آپ نے بعد میں بھی جوں کا توں رہنے دیا۔'' محمود نے پوچھا۔

''ہاں، یہی بات ہے۔''

''خیر، بیگم کے گم ہونے کے بعد آپ نے کیا کیا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ اخبارات میں اعلان کرائے۔

''سبھی کچھ کرایا تھا۔ پولیس نے بہت بھاگ دوڑ کی، لیکن بیگم کا کہیں پتا نہ چلا۔''

''تو کیا پولیس نے حویلی میں آ کر چھان بین نہیں کی۔ اس کنویں

کو نہیں دیکھا۔''

''ضرور دیکھا تھا، لیکن اس کنویں کی طرف تو کسی کا دھیان بھی نہیں گیا۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''جس کمرے میں بیگم صاحبہ رات کو سوئی تھیں۔ اس کمرے میں کچھ کھینچ تان یا لڑائی بھڑائی کے آثار تو نظر نہیں آئے تھے۔''

''نہیں، بستر کی چادر پر سلوٹیں ضرور تھیں۔ بستر پر سوئی تو وہ میرے سامنے ہی تھی۔ چپل بھی بستر کے پاس نہیں ملے تھے۔ اس سے پولیس نے بھی اندازہ لگایا تھا کہ بیگم جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے۔''

''آپ بھی اسی کمرے میں ساتھ والے بستر پر سو رہے تھے؟'' محمود نے پوچھا۔

''ہاں، لیکن میری نیند بہت گہری ہے۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ بستر سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ کے تینوں ملازم، کیا اب بھی آپ کے ملازم ہیں؟''

''جی ہاں، نئی کوٹھی میں بھی میں نے انہیں کو رکھا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''نئی کوٹھی آپ نے خود بنوائی ہے یا بنی بنائی خریدی ہے۔'' فاروق نے سوال کیا۔

''خود بنوائی ہے۔ بیگم کے گم ہونے کے بعد حویلی میں ہمارا دم

گھٹنے لگا تھا، سو میں نے شہر کی حدود میں زمین خریدی اور کوٹھی کی تعمیر شروع کرادی۔ اس وقت تک ہم نے حویلی فروخت کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ ایاز راؤ اچانک ہی کہہ بیٹھے کہ حویلی ان کے ہاتھوں فروخت کردی جائے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہر سے دور اس سنسان جگہ کوئی یہ حویلی خریدنا پسند کرے گا، لہٰذا میں نے اکی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ایاز راؤ نے خود ہی پیش کش کی تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے حویلی انہیں فروخت کردی۔''

''کیا وہ آس پاس کے زمینیں پہلے ہی خرید چکے تھے؟'' فرزانہ نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

''نہیں، یہ پروگرام حویلی خریدنے کے کئی ہفتے بعد بنا۔ لطف کی بات یہ کہ زمینوں کے مالک بھی زمینیں بیچنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ اس طرح ایاز راؤ کا کام آسانی سے ہوگیا۔''

اسی وقت اکرام نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا:

''تمام ضروری کارروائی مکمل ہوچکی ہے۔ میں بھی واپس جارہا ہوں۔ اگر میری ضرورت پڑے تو فون کردینا۔''

''اچھی بات ہے۔ ہم ذرا کنویں کے آس پاس کا ایک بار اور جائزہ لیں گے۔ اس کے بعد گھر چلے جائیں گے۔'' محمود بولا۔

''اکرام چلا گیا۔اس کے بعد انہوں نے سردار تیمور کا بھی شکریہ ادا کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کنویں کے پاس آئے اور بغور اردگرد

کا جائزہ لینے لگے۔

''ہم تو اس طرح آس پاس کا جائزہ لے رہے ہیں، جیسے دو سال پہلے کے کچھ آثار یہاں موجود ہوں۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''تم نہ دیکھو، آنکھیں بند کرلو۔ کہیں تھک نہ جائیں۔'' فرزانہ جل کر بولی۔

''جلنا بھننا تو گویا تمہاری گھٹی میں پڑا ہے۔ آخر ہم یہاں کیا دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں تو ابھی ایاز راؤ سے بھی سوالات کرنا ہیں۔'' فاروق نے بھنا کر کہا۔

اسی وقت محمود نے جھکتے ہوئے مٹی میں سے کوئی چیز پکڑ کر کھینچ لی۔ یہ مٹی کنویں میں سے مزدوروں نے لاش کے آس پاس سے ہٹائی تھی اور اسے انہوں نے چار دیواری کے پاس نہیں پھینکا تھا، کیونکہ اس وقت تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ فاروق اور فرزانہ نے دیکھا، محمود کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ سے کاغذ کا ٹکڑا تھا۔

☆☆☆

اوہ یہ کیا

''اب کاغذ کے اس ٹکڑے کے ذریعے تفتیش کی گاڑی آگے دھکیلی جائے گی۔'' فاروق نے مذاق اڑایا۔

''ہاں، بات تو تم نے پتے کی کہی۔'' محمود مسکرایا۔

''پتے کی بات۔ ارے نہیں بھئی۔ میں نے تو یہ بات مذاق میں کہی ہے۔'' فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

''کچھ بھی ہو، تفتیش اس کاغذ کے پرزے کی مدد سے ہی آگے بڑھے گی۔'' محمود پرخیال انداز میں بولا۔

''اوہو، ایسی کیا بات ہے اس پرزے میں۔ فرزانہ چونک کر بولی اور پھر دونوں پرزے کے دوسرے رخ کی طرف بڑھے۔ یہ دیکھ کر ان کی حیرت بڑھی کہ وہ پرزہ ایک نقشہ تھا۔

''ارے، یہ تو کسی خزانے کا نقشہ ہے۔'' فاروق نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''اور ہے بھی اسی حویلی اور کنویں کا۔ یہ دیکھو، حویلی کی

چاردیواری اور یہ رہا دائرہ۔ یہ دائرہ ضرور کنویں کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ حویلی کا دروازہ ہے۔ اس دروازے سے تیر کے نشانات کنویں کی طرف جارہے ہیں۔ دروازے کے دوسری طرف سے بھی تیر کے نشانات اسی طرف کا رخ کررہے ہیں۔ دائرے کے اوپر لفظ خزانہ درج ہے۔ تت، تو کیا یہ کسی خزانے کا چکر ہے۔'' محمود نے جلدی جلدی کہا۔

''اور تم نے ان دھبوں کی طرف تو دیکھا ہی نہیں۔ یہ صرف اور صرف خون کے دھبے ہیں، گویا جس وقت نازلی اورنگ کو گولی ماری گئی، یہ پرزہ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔'' فرزانہ نے دھبوں کی طرف انگلی سے اشارا کیا۔

''ہوں، تم ٹھیک کہتی ہو۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نازلی اورنگ کسی دوسرے شخص کے ساتھ مل کر راتوں کو یہ خزانہ تلاش کیا کرتی تھی۔ آخر انہوں نے یہ اندازہ لگالیا کہ خزانہ کنویں کے اندر دفن ہے، چنانچہ انہوں نے کنویں میں سے مٹی ہٹانا شروع کی اور جب خزانہ مل گیا تو دوسرا شخص نازلی اورنگ کو گولی مار کر اور خزانہ نکال کر چلتا بنا، تاکہ نازلی اورنگ کو حصہ نہ دینا پڑے۔ اب سوال یہ ہے کہ دوسرا شخص کون ہے؟'' فاروق نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''اگر یہ معلوم ہوجائے تو سارا معاملہ ہی نہ صاف ہوجائے۔ عقل کے ناخن لو۔'' فرزانہ نے جھلاتے ہوئے انداز میں کہا۔

''اچھا، دے دو۔'' فاروق مسکرایا۔

''کیا؟'' محمود بے خیالی میں بولا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا۔

''عقل کے ناخن۔''

''سنو، ہمیں پہلے تو ایاز راؤ کو ٹٹولنا ہے۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ وہ دوسرا شخص کون ہوسکتا ہے۔ معاملہ اب اور بھی دلچسپ ہوگیا ہے، کیونکہ قتل کی وجہ سامنے آگئی ہے۔'' محمود نے فاروق کی بات کی طرف توجہ دیے بغیر کہا۔

''تو پھر آؤ، پہلے ان سے ہی بات کریں۔''

محمود نے نقشے کا کاغذ احتیاط سے تہہ کیا اور جیب میں رکھ لیا۔

ایاز راؤ انہیں عرفان راؤ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں مل گیا۔

''سردار تیمور اور فوزیہ صاحبہ چلے گئے شاید۔'' محمود بولا۔

''ہاں، ابھی ابھی گئے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جب لاش واپس ملے گی تو اسے لے کر واپس یہیں آئیں گے۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ ان کی بیوی کی قبر اسی حویلی میں اس کنویں کے پاس ہی بننے دی جائے۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اجازت دے دی، یوں بھی سردار تیمور میرا بہت اچھا دوست ہے۔''

''انکل، ہم آپ سے چند سوالات کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ محسوس نہ کریں۔''

''اس میں محسوس کرنے کی کیا بات ہے بھئی۔ تم سوال نہیں کرو گے، پولیس کرے گی۔'' وہ بولے۔

''بیگم سردار تیمور کی زندگی میں۔ میرا مطلب ہے، ان کے گم ہونے سے پہلے آپ اکثر یہاں آتے رہتے ہوں گے۔''

''ہاں، سردار تیمور میرا بچپن کا دوست ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''سردار تیمور صاحب نے نازلی اورنگ سے کب شادی کی تھی؟''

''حویلی خریدنے کے فوراً بعد، یعنی آج سے تقریباً تیس سال پہلے۔'' انہوں نے بتایا۔

''جی۔'' محمود حیران رہ گیا: ''حویلی خریدنے کے فوراً بعد۔''

''ہاں، شاید سردار تیمور نے تمہیں بتایا نہیں۔ ان کی بیوی دراصل حویلی کے غیر ملکی مالک کی بیٹی ہی تھیں۔ حویلی فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی بیٹی کی شادی بھی سردار تیمور سے کرنے کا فیصلہ کرلیا اور سردار تیمور کو بھی یہ فیصلہ پسند آگیا، چنانچہ دونوں کی شادی ہوگئی۔'' انہوں نے بتایا۔

''اوہ۔'' ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ یہ انہیں ایک اور نئی بات معلوم ہوئی تھی۔

☆☆☆

چند لمحے تک مکمل خاموشی رہی، پھر محمود نے کہا:

''آپ نے ایک حیرت انگیز بات بتائی۔ سردار تیمور صاحب نے یہ بات ہمیں نہیں بتائی تھی۔ شاید انہیں خیال نہیں رہا، یا پھر انہوں نے یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی ہوگی۔ خیر آپ ذرا یہ بتائیے، یہ

نازلی اورنگ کس قسم کی عورت تھیں۔''

''اچھی ہی تھیں۔ بے چین سی طبیعت پائی تھی انہوں نے۔ کھوئی کھوئی سی بھی رہتی تھیں۔''

''اور یہ فوزیہ انہی کی لڑکی ہے؟''

''ہاں، ان کے بس ایک ہی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔''

''اور نازلی اورنگ حویلی میں ہی رہتی تھیں، کبھی گھومنے پھرنے نہیں جایا کرتی تھیں؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

''کیا بات کرتے ہیں۔ گھومنے پھرنے کی تو وہ اس قدر شوقین تھیں کہ سردار تیمور بھی اس معاملے میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ بہت کم وہ ان کے ساتھ جاتے تھے، ورنہ عام طور پر وہ تنہا ہی گھر سے نکل جاتیں اور گھنٹوں باہر رہا کرتی تھیں۔''

''اور سردار تیمور کو ان کی اس عادت پر کوئی اعتراض نہیں تھا؟'' فاروق نے پوچھا۔

''نہیں، وہ جانتے تھے۔ نازلی اورنگ ایک غیر ملکی لڑکی ہے اور اس ملک کی لڑکیاں گھر میں بیٹھ رہنے کی عادی نہیں ہوتیں۔ گھومنا پھرنا ان کی زبردست عادت ہوتی ہے، لہٰذا انہوں نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ انہیں دراصل اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔''

''ہوں، ان کے گم ہونے پر ان کی تلاش کے سلسلے میں کیا آپ نے بھی اپنے دوست کا ہاتھ بٹایا تھا؟'' محمود نے پوچھا۔

''بالکل، دن رات ایک کر دیے تھے، لیکن کچھ نہ بن سکا اور بنتا بھی کیسے۔ وہ بے چاری تو اس کنویں میں قتل ہوئی پڑی تھی۔'' ایاز راؤ نے سرد آہ بھری۔

''آپ کا خیال بھی اس کنویں کی طرف نہیں گیا۔''

''دراصل اس وقت یہ تو کسی نے سوچا ہی نہیں کہ نازلی اورنگ اس حویلی کے کنویں میں دفن ہو سکتی ہے۔ ہم سب کا تو بس ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ نازلی، جو ایک غیر ملکی اور سیر و سیاحت کی شوقین عورت تھی۔ اس ملک سے اس کا جی بھر گیا اور وہ یہاں سے بھاگ نکلی۔ جہاز پر سیٹ اس نے کسی فرضی نام سے بک کرا رکھی ہوگی۔ بس وہ رات کے وقت اٹھی اور ایئرپورٹ پر پہنچ گئی۔ ہم سب نے اور پولیس نے بھی یہی رائے قائم کی تھی، لہٰذا اس رائے کی روشنی میں کنواں کیسے نظر آتا۔''

''اور نازلی اورنگ کا باپ......''

''حویلی فروخت کرنے کے بعد وہ اپنے ملک چلا گیا تھا۔ اس نے حویلی فروخت اسی لیے کی تھی۔''

''تب پھر اس نے اپنی بیٹی کی شادی سردار تیمور سے کیوں کی تھی۔ وہ اپنے ملک جا کر اپنے ملک کے کسی نوجوان سے بھی اس کی شادی کر سکتا تھا۔''

''ہاں، کر سکتا تھا، لیکن شاید اسے اپنی بیٹی کے لیے سردار تیمور ہی

پسند آ گیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''آپ کے خیال میں نازلی اورنگ کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' انہوں نے حیران ہوکر کہا۔

''کیا سردار تیمور ایسا کر سکتے تھے؟'' فرزانہ نے ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہرگز نہیں، انہیں اپنی بیوی سے بہت محبت تھی اور پھر فوزیہ، اپنی پیاری بیٹی کو وہ ماں سے آخر کیوں جدا کرتے۔''

''ہوں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اسی لیے ہم آپ کی طرف آئے ہیں۔'' فاروق مسکرایا۔

''میری طرف، کیا مطلب۔ میرے پاس ہی تو بیٹھے ہو تم لوگ۔''

''میرا مطلب تھا، کیا آپ نے تو نازلی اورنگ کو قتل نہیں کیا۔''

''ارے باپ رے، یہ کتنا خوف ناک سوال ہے۔ بھلا میرا اس قتل سے کیا تعلق؟'' ایاز راؤ بوکھلا اٹھے۔

''آپ کو خزانوں سے تو دلچسپی نہیں؟'' فرزانہ نے جلدی سے سوال کیا۔

''خزانوں سے، کیا مطلب؟''

''زمین میں دفن شدہ خزانوں سے۔''

''نن۔ نہیں۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میں ان فضول کاموں میں نہیں پڑتا۔'' انہوں نے بُرا سا منہ بنایا۔

''آپ نے کبھی سردار تیمور یا نازلی اورنگ کے منہ سے کسی خزانے کے بارے میں کچھ کہتے سنا۔''

''بالکل نہیں، سردار تیمور بھی کافی دولت مند آدمی ہیں۔ میرا خیال ہے۔ انہیں بھی خزانوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی، لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس معاملے میں کسی خزانے کا کیا ذکر۔''

جواب میں محمود مسکرایا، پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نقشے کا کاغذ نکال کر ایاز راؤ اور عرفان کے سامنے کردیا۔ انہوں نے حیرت زدہ انداز میں اسے دیکھا اور پھر ایاز راؤ نے ہکلا کر کہا۔

''یہ۔ یہ کیا ہے؟''

''خزانے کا نقشہ، کنویں سے نکلنے والی مٹی میں سے ملا ہے۔'' محمود بولا۔

''اوہ۔'' ایاز راؤ کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

''اس حویلی کے نیچے کوئی تہہ خانہ تو نہیں ہے؟'' فاروق بغیر کسی خیال کے پوچھ بیٹھا۔

''ہاں ہے، ضرور ہے، کیوں؟''

''کیا کہا، تہہ خانہ موجود ہے؟'' محمود نے حیران ہوکر کہا اور فاروق مسکرانے لگا۔

''میں نے کہا نا، تہہ خانہ موجود ہے۔''

''مہربانی فرما کر ہمیں فوراً تہہ خانہ دکھایئے۔'' فرزانہ بے چین

ہوگئی۔

''آؤ، دکھا دیتا ہوں۔''

''ویسے کیا آپ اسے اندر سے دیکھ چکے ہیں؟''

''ابھی تک نہیں۔ سردار تیمور نے اوپر سے ہی دکھایا تھا۔''

''ہوں، یہ تو کوئی عجیب چکر معلوم ہوتا ہے۔ کہیں خزانہ اسی تہہ خانے میں تو نہیں تھا؟'' فرزانہ بڑبڑائی۔

محمود اور فاروق نے کوئی جواب نہ دیا، پھر وہ ایاز راؤ کے پیچھے چلتے حویلی کے ایک اندرونی کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے کے فرش پر چٹائی بچھی تھی۔ انہوں نے چند منٹ تک گندی ہوا خارج ہونے کا انتظار کیا اور پھر ٹارچوں کی روشنی میں نیچے اترنے لگے۔

یہ ایک کافی کشادہ تہہ خانہ تھا۔ نیچے اترتے ہی ناگوار سی بو ان کے نتھنوں میں آنے لگی۔

''حیرت ہے، یہ بو بند ہوا کی تو نہیں ہے۔'' محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

''ہاں، یہ تو ایسی بو ہے، جیسی کسی مردے اٹھتی ہے۔'' فرزانہ نے کہا۔

انہوں نے گھبراہٹ کے عالم میں پورے تہہ خانے کو ٹارچوں کی مدد سے دیکھ ڈالا، لیکن وہاں کوئی مردہ جسم نہیں تھا، البتہ ایک دیوار میں انہیں گول گول سے تین چار سوراخ ضرور نظر آئے۔ یہ بو ان سوراخوں

کے پاس اور زیادہ آنے لگی۔

''معلوم ہوتا ہے۔ یہ سوراخ چوہوں نے بنائے ہیں اور ان کے اندر کچھ چوہے مر گئے ہیں۔'' محمود نے خیال ظاہر کیا۔

''ہوں، ضرور یہی بات ہے۔ آئیے چلیں۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔'' فرزانہ نے ہاتھ ناک پر رکھتے ہوئے کہا۔

اور وہ باہر نکل آئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا، پھر وہ ایاز راؤ اور عرفان سے رخصت ہو کر باہر آئے اور پیدل ہی چل پڑے۔ خان رحمان کو شاید اچانک کوئی کام یاد آ گیا تھا، ورنہ وہ انہیں ساتھ لے کر ہی جاتے۔

''وہ بدبو مجھے ابھی تک پریشان کر رہی ہے۔'' محمود نے الجھن کے عالم میں کہا۔

''میں نے آج تک ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا، جو بدبو سے خوش ہوتا ہو۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''میرا مطلب ہے، وہ بو میرے دماغ میں الجھن پیدا کر رہی ہے۔'' محمود نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

''بو دماغ میں سکون اور اطمینان پیدا کر بھی نہیں سکتی۔'' فاروق بھلا کہاں رکنے والا تھا۔

''دھت تیرے کی۔'' محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

''شکریہ، مجھے امید تھی کہ اب تم اپنی ران کی خبر ضرور لوگے۔''

''اچھا بس، مجھے فرزانہ سے بات کرنے دو۔'' محمود نے تقریباً چیخ کر کہا اور فرزانہ کی طرف رُخ کیا۔

''کیوں فرزانہ، تمہارا اس بدبو کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''وہی جو تمہارا۔'' فرزانہ کی بجائے فاروق نے جھٹ سے جواب دیا۔ فرزانہ نے بھی اس کی طرف تلملا کر دیکھا۔

''ارے، ہم اس کاغذ کو تو بھول ہی گئے، جس پر نقشہ بنا ہے۔ اس پر خون کے دھبے بھی تو ہیں۔ میرا خیال ہے، ہم اس کاغذ کو بھی لیبارٹری والوں کے حوالے کر دیں۔ شاید معلوم ہو جائے کہ اس پر لگا ہوا خون نازلی اورنگ کا ہی ہے یا کسی اور کا۔''

''میرا خیال ہے، اتنے عرصے کے خون سے کچھ معلوم نہیں کیا جاسکتا۔'' محمود نے کہا۔

''پھر بھی کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔''

انہوں نے نقشے والا کاغذ لیبارٹری پہنچایا اور ایک پبلک فون بوتھ سے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ فون میں ان کی امی کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو محمود، خیر تو ہے۔ تم کہاں سے بول رہے ہو؟''

''جی، ایک پبلک فون بوتھ سے۔ ابا جان آچکے ہیں یا نہیں؟''

''ابھی تک نہیں آئے۔''

''ادھر ہم بھی الجھے ہوئے ہیں۔ عرفان راؤ کے گھر میں آخر ایک چکر ہی ہو گیا۔''

''ارے اچھا، یہ تو بڑی مزے دار خبر ہے۔'' بیگم جمشید ہنس کر بولیں۔

''جی ہاں، آپ مزے دار بھی کہہ سکتی ہیں۔ ہم ذرا مصروف ہیں۔ دیر سے لوٹیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رات کو آئیں ہی نہ۔ آپ فکر مند نہ ہو جایئے گا۔''

''اچھا، نہیں ہوں گی۔'' انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

''آؤ بھئی، ذرا سردار تیمور کے ملازموں سے بات ہو جائے۔'' محمود بولا۔

''لیکن تمہارے دماغ میں تو وہ بُو کھد بد مچا رہی تھی۔'' فاروق نے طنز بھری آواز میں کہا۔

''اسے بھی دیکھیں گے، بدبو نہ ہوئی، ہوائی جہاز ہو گیا۔'' فاروق نے حیرت سے آنکھیں نچائیں۔

''بدبُو کا ہوائی جہاز سے کیا تعلق؟'' فرزانہ ہنسی۔

''جملہ بولنے کے لیے ضروری نہیں کہ کسی چیز کا کسی چیز سے تعلق بھی ہو۔'' فاروق نے بھی مسکرا کر کہا۔

''فرزانہ، تم بھی اس کی باتوں پر ہنس رہی ہو۔'' محمود کو اس پر غصہ آ گیا۔

''اور کیا کروں۔ ہم اس پر غصے ہو کر بھی کیا کرلیں گے، یہ ٹھہرا ڈھیٹ۔''

''اے اے فرزانہ، ذرا زبان سنبھال کر۔ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔''

اسی وقت انہیں ایک ٹیکسی نظر آ گئی اور وہ سردار تیمور کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد فرزانہ نے کہا:

''آخر وہ دوسرا شخص کون تھا، جو نازلی اورنگ کے ساتھ خزانہ تلاش کیا کرتا تھا۔''

''کیا خبر وہ اس کا باپ رہا ہو۔'' فاروق نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

''کیا بکواس ہے۔ اس کا باپ تو حویلی فروخت کرنے اور بیٹی کی شادی سردار تیمور سے کرنے کے فوراً بعد ملک سے چلا گیا تھا۔''

''لیکن ہمیں کیا معلوم کہ وہ گیا تھا یا نہیں۔'' فاروق نے پر زور لہجے میں کہا: ''ایک شخص کسی جہاز کی سیٹ بک کراتا ہے اور دوسروں کو جہاز کا ٹکٹ وغیرہ دکھا کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ملک سے باہر جا رہا ہے، لیکن وہ اس جہاز پر سوار ہی نہیں ہوتا، یا سوار ہو کر چلا بھی جاتا ہے اور پھر چپ چپاتے واپس آ جاتا ہے۔ کیا یہ مشکل ہے۔''

''ہوں، یار فاروق، اس وقت تو واقعی آپ نے پتے کی بات کہی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ حویلی فروخت کر کے بھی یہاں رہ سکتا تھا۔ سردار تیمور نے اسے ملک چھوڑنے پر مجبور تو کر نہیں دیا تھا۔''

''ہو سکتا ہے، وہ کسی وجہ سے یہاں خفیہ طور پر رہنا چاہتا ہو۔'' فاروق نے جواب دیا۔

''اگر بات یہی ہے تو پھر یہ ضرور کوئی سنسنی خیز معاملہ ہے۔'' فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

''ہمارا واسطہ غیر سنسنی خیز معاملات سے پڑتا ہی کب ہے۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

اسی وقت وہ اعظم روڈ پر پہنچ گئے۔ گرین لائن میں اتر کر انہوں نے بل ادا کیا اور پھر سردار تیمور کے دروازے کا بٹن دبایا۔

''آج تو انکل خان رحمان کی وجہ سے ہمیں ٹیکسیوں میں گھومنا پڑ رہا ہے۔'' فاروق بولا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ اتنے اچھے انکل کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔''

جلد ہی اسی ملازم نے دروازہ کھولا، جس نے پہلے کھولا تھا۔

''آپ سردار صاحب کے ہاں کب سے ملازم ہیں؟''

''برسوں ہو گئے۔''

''بیگم صاحبہ نازلی اورنگ کیسی عورت تھیں؟''

''بہت اچھی، بہت سخی۔ غریبوں کا ہر وقت خیال رکھنے والی۔'' اس نے کہا۔

''اس کے گم ہونے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''آج تک حیران ہیں، لیکن آپ یہ سوالات کیوں پوچھ رہے ہیں۔'' بوڑھے ملازم نے چونک کر کہا۔

''کیا سردار تیمور صاحب نے آپ لوگوں کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔''

''وہ ابھی تک لوٹے ہی کب ہیں۔'' ملازم نے کہا۔

''کیا مطلب، وہ تو کافی دیر پہلے حویلی سے رخصت ہو چکے ہیں۔''

''یہاں تو پہنچے ہی نہیں، ممکن ہے کسی کام سے چلے گئے ہوں۔''

''ہوں تو خیر، ہم بتائے دیتے ہیں، لیکن اس طرح نہیں، پہلے اندر چلیے، بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

ملازم کی حیرت بڑھ گئی۔ وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ پھر ان کے صوفوں پر بیٹھنے کے بعد خود قالین پر بیٹھنے لگا۔

''ارے ارے، اوپر بیٹھیے نا۔ یہ کیا کر رہے ہو۔''

''شکریہ جناب۔'' اس نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہمارا تعلق یوں سمجھ لیں کہ پولیس سے ہے۔''

''یوں سمجھ لیں سے کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس نے حیران ہو کر کہا اور وہ سمجھ گئے کہ ملازم تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی ہے۔

''ہمارے والد محکمہ سراغرسانی میں ہیں۔ ان کی طرف سے ہم اس وقت تفتیش کر رہے ہیں۔'' فرزانہ جلدی سے بولی۔

''لیکن کس سلسلے میں؟'' اس نے چونک کر کہا۔

''حویلی میں ایک بند کنواں تھا، اکثر دیکھا ہوگا آپ نے۔''

''جی ہاں، تو پھر۔'' اب اس کی بے چینی میں حد درجے اضافہ ہو گیا تھا۔

''ایاز راؤ نے اس کنویں کی کھدائی شروع کرائی تھی۔ اس میں سے ایک عورت کی لاش نکل آئی اور وہ لاش سردار تیمور کی بیوی نازلی اورنگ کی ثابت ہو گئی ہے۔''

''نہیں۔'' ملازم نے چیخ کر کہا۔

''حقیقت یہی ہے۔ آپ اس معاملے پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ کیا سردار تیمور اپنی بیوی کے قاتل ہو سکتے ہیں؟''

''ہرگز نہیں، سردار صاحب ایسے نیک اور اچھے آدمی تو ڈھونڈے سے نہیں ملتے اس زمانے میں۔'' اس نے فوراً کہا۔

''تب پھر آپ کیا کہتے ہیں۔ یہ کام بھلا کس کا ہو سکتا ہے۔''

''میں نہیں جانتا۔ یہ حادثہ میرے لیے بہت خوف ناک ہے۔ بیگم صاحبہ کی صورت میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔''

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی اور وہ اٹھ کر باہر کی طرف لپکا، پھر سردار تیمور اور فوزیہ کے ساتھ لوٹا۔

''اوہو، آپ لوگ کہاں رہ گئے تھے، ہم تو بہت پریشان تھے۔''

''میں اپنے وکیل سے ملنے گیا تھا۔'' انہوں نے سرد آواز میں

کہا۔

''وہ کس لیے؟'' محمود بولا۔

''قبل از گرفتاری ضمانت کرانے کے سلسلے میں۔''

''لیکن کیوں، آپ کو ضمانت کرانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ کیا کوئی آپ کو گرفتار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟''

''مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے، جیسے میری بیوی کے قتل کے الزام میں مجھے ہی گرفتار کرلیا جائے گا۔ یہ ضرور کوئی بھیانک سازش ہے۔ جو میرے خلاف کی گئی ہے، لہٰذا میں نے یہ بندوبست کیا ہے۔ صبح میرا وکیل میری ضمانت کرائے گا۔''

''ہم یہاں آپ کے ملازموں سے سوالات کرنے آئے تھے۔ امید ہے، آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' محمود نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ کو جواب نہیں دیں گے تو پولیس کو جواب دینا ہوں گے، بات تو ایک ہی ہے۔''

''شکریہ۔ اس وقت تک ہم صرف ایک ملازم سے سوالات کرسکے ہیں، یعنی ان سے۔ کیا نام ہے بابا آپ کا؟''

''مجید خان۔'' ملازم بولا۔

''مہربانی فرماکر اب دوسرے ملازم کو ڈرائنگ روم میں بھیج دیں۔''

''جی اچھا۔'' اس نے کہا اور چلا گیا۔

''کیا ہماری موجودگی کی ضرورت ہے۔'' سردار تیمور نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

''جی نہیں، آپ آرام فرمایئے۔'' محمود نے کہا۔ دونوں چلے گئے۔ جلد ہی دوسرا ملازم اندر داخل ہوا۔ یہ بھی بوڑھا آدمی تھا۔

''آپ کا نام؟''

''فیروز علی۔'' اس نے کہا۔

''مجید خان نے آپ کو بتا ہی دیا ہوگا کہ کیا معاملہ ہے۔''

''جی ہاں۔'' اس نے پریشان آواز میں کہا۔

''تو پھر، کیا آپ کوئی خاص بات بتا سکتے ہیں؟''

''میں مالی ہوں جناب، حویلی کے باغ کی دیکھ بھال میرے ذمے تھی۔ بیگم صاحبہ کے گم ہونے سے پہلے میں نے کئی بار رات کے وقت باغ میں دو سائے حرکت کرتے دیکھے تھے، وہ کھسر پھسر بھی کیا کرتے تھے۔ میں آدمی ہوں ذرا ڈرپوک قسم کا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ انہیں آواز دے کر پوچھ سکوں کہ کون ہیں۔ میں نے ایک دو بار سردار صاحب سے ضرور ان کا ذکر کیا تھا، لیکن انہوں نے ہنس کر ہی جواب دیا کہ فیروز علی، تمہیں ضرور وہم ہوگیا ہے۔ بھلا باغ میں کوئی کیا لے گا، وہاں کیا رکھا ہے۔ پھولوں کے پودے اور بغیر پھل کے درخت۔''

''آپ نے انہیں کیسے دیکھ لیا، جب کہ سردار تیمور کا بیان ہے کہ تینوں ملازم حویلی کے اندر سوتے تھے۔'' فاروق نے پوچھا۔

''میرے کمرے کی ایک کھڑکی حویلی کے پچھلے حصے کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی میں سے میں نے پہلے تو ان کی آوازیں سنیں اور پھر کھڑکی تھوڑی سی کھول کر انہیں دیکھا بھی۔''

''کیا آپ انہیں پہچان نہیں سکے؟''

''وہ ایک مرد اور ایک عورت تھے، لیکن میں انہیں پہچان نہیں سکا۔''

''آپ کے کمرے کی کھڑکی اس کنویں سے کتنی دور تھی؟''

''کافی دور، کنواں نظر نہیں آتا تھا۔''

''ہوں، تو اس بات کا ذکر جہاں آپ نے سردار تیمور سے کیا تھا، وہاں اپنے ساتھی ملازموں سے بھی کیا ہوگا۔ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی خیال قائم نہیں کیا؟''

''وہ دونوں پرانے خیالات کے ہیں۔ ڈر گئے تھے اور خیال ظاہر کیا تھا کہ حویلی ضرور آسیب زدہ ہے۔ حویلی یوں بھی بہت پرانی ہے۔''

''ہوں، اچھا خیر۔ اب آپ تیسرے ملازم کو بھیج دیں۔'' محمود نے کہا۔

''ٹھہرو بھئی، ایک سوال اور۔ بیگم صاحب کی گمشدگی کے بعد بھی وہ دونوں سائے بھی دکھائے دیے۔'' فاروق بول پڑا۔

''جی نہیں، کبھی نہیں۔''

''شکریہ۔ آپ جا سکتے ہیں، تیسرے ملازم کو بھیج دیں۔''

''جی اچھا۔'' اس نے سکون کا لمبا سانس لیا اور چلا گیا۔ جلد ہی تیسرا ملازم اندر داخل ہوا۔ یہ پہلے دو کی نسبت کم عمر تھا۔ اس نے اپنا نام عمر دین بتایا اور فیروز علی کی باتوں کی تصدیق کی، تاہم اس نے یا مجید خان نے سائے نہیں دیکھے تھے اور اس طرح اتنی بھاگ دوڑ کے بعد بھی وہ کوئی کام کی بات معلوم نہ کر سکے۔ تھک ہار کر انہوں نے واپسی کی ٹھانی۔ گھر پہنچے تو انسپکٹر جمشید آ چکے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی مسکرائے۔

''خان رحمان نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تو تم نے وہاں پہنچ کر چکر چلوا ہی دیا۔''

''جی ہاں، میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔'' فاروق بے چارگی کے عالم میں بولا۔

''اب تم مجھے پوری تفصیل سنا دو، اور یہ بھی کہ کیا کیا تیر مار کر آئے ہو؟''

''جی اچھا۔'' محمود نے کہا اور تفصیل سنا دی۔

محمود کے خاموش ہونے پر بھی انسپکٹر جمشید چند لمحے تک سوچ میں گم رہے۔ آخر انہوں نے کہا۔

''آؤ چلیں۔''

''جی، کہاں کا ارادہ ہے؟''

''حویلی تک چلیں گے بھئی۔ تم ایک دو باتیں نظر انداز کر گئے ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''مثلاً کون کون سی؟'' محمود نے حیران ہو کر کہا۔

''پہلی تو یہ کہ لاش کے آس پاس کی مٹی خون آلود تھی یا نہیں۔ یہ بات تم نے نوٹ ہی نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ تہہ خانے میں جو سوراخ تمہیں نظر آئے تھے، ان میں سے آنے والی بو انسانی تھی یا چوہوں کی۔ اگر بو انسانی تھی تو پھر اس تہہ خانے کا بغور جائزہ لینا پڑے گا۔''

''اوہ، آپ تو ہمیں ڈرائے دے رہے ہیں۔''

''باغ میں اگر وہ سائے سردار تیمور کے ملازم کو نظر آئے تھے تو پھر اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس تہہ خانے میں یا کنویں میں ہی ایک اور لاش موجود ہو۔''

''اوہ۔'' وہ دھک سے رہ گئے۔

''ٹھہرو، پہلے میں اکرام سے وہ نقشہ منگوا لوں۔ میں اسے بھی ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی مل جائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ اکرام کو فون کرنے لگے۔

''اس کا مطلب ہے، آج کی رات گئی۔'' فاروق نے مردہ آواز میں کہا۔

''ہر روز ایک رات جاتی ہے، اس میں نئی کیا بات ہے۔'' فرزانہ

جل کر بولی۔

''میرا مطلب ہے، آج کی رات کا آرام گیا۔''

''اگر تم ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتے تو شوق سے آرام کر سکتے ہو۔'' محمود بولا۔

''یہی تو مصیبت ہے۔'' فاروق منمنایا۔

''کیا مصیبت ہے؟'' فرزانہ نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے شوق سے سونا نہیں آتا۔'' اس نے شریر آواز میں کہا۔ اتنے میں انسپکٹر جمشید فون کر چکے تھے۔ ریسیور رکھتے ہوئے بولے۔

''اکرام آ رہا ہے۔ ہم تھوڑی دیر بعد چلیں گے۔ اس دوران اگر تم کچھ کھانا پینا چاہو تو کھا پی سکتے ہو۔''

''جی بہتر۔''

''آدھ گھنٹے بعد اکرام وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا:

''نازلی اورنگ کی لاش میں سے پستول کی گولی برآمد کر لی گئی ہے۔ گولی حاضر ہے۔ پوسٹ مارٹم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ پستول کی نالی اس کے عین پیٹ پر رکھ کر گولی چلائی گئی ہے، لیکن چونکہ پستول چھوٹا تھا، اس لیے گولی دوسری طرف نہیں نکل سکی۔''

''شاید پستول بھی اس ملبے میں ہی کہیں ہو۔ صبح ہم یہ کام بھی کرائیں گے۔ یعنی ملبہ چھنوائیں گے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اور وہ نقشہ اور اس پر لگا ہوا خون؟'' محمود نے بے چینی سے

عالم میں پوچھا۔

''نقشہ بھی حاضر ہے۔ ماہرین کا خیال یہی ہے کہ نقشے پر خون نازلی اورنگ کا ہی ہے، لیکن سو فی صد یقین سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ خون دو سال پُرانا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اور نقشے کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟'' فاروق نے پوچھا۔

''کیا مطلب، بھلا نقشے کے بارے میں ان کا کیا خیال ہوسکتا ہے۔ انہیں تو نقشہ خون کا جائزہ لینے کے لیے دیا گیا تھا۔'' اکرام نے حیران ہوکر کہا۔

چھوڑیں انکل، یہ تو یوں ہی بے تکے سوال کیا کرتا ہے۔'' فرزانہ نے طنزیہ کہا۔

انہوں نے دیکھا، انسپکٹر جمشید نقشے کو بغور دیکھ رہے تھے، پھر انہوں نے چونک کر کہا۔

''فاروق، تم نے کیا پوچھا تھا اکرام سے؟''

''ایک بے تکا سوال ابا جان۔'' فرزانہ جلدی سے بولی۔

''میں فاروق سے پوچھ رہا ہوں فرزانہ۔'' انسپکٹر جمشید منہ بنا کر بولے۔

''اوہ، مجھے افسوس ہے ابا جان۔''

''جی میں نے یہ پوچھا تھا کہ ماہرین کا اس نقشے کے بارے میں

کیا خیال ہے؟''

''اور تم نے ٹھیک سوال کیا تھا، لیکن ظاہر ہے، پوسٹ مارٹم کے ماہرین نقشے کے بارے میں رپورٹ دے ہی نہیں سکتے، لہٰذا آؤ، ہم نقشوں کے ایک ماہرین کے پاس چلیں۔''

''جی، کیا مطلب؟'' فرزانہ حیران ہوکر بولی۔

''مطلب تو ہمیں وہ ماہر ہی بتائیں گے۔'' انہوں نے کہا اور پھر جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ اکرام کو انہوں نے جانے کی اجازت دے دی۔

جلد ہی وہ ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رکے۔ انسپکٹر جمشید نے نیچے اتر کر بٹن دبایا۔ جلد ہی ایک نوجوان آدمی نے دروازہ کھولا اور پھر چونک کر بولا:

''ارے انسپکٹر صاحب، آیئے آیئے، تشریف لایئے۔ میرے ایسے نصیب کہاں کہ آپ جیسے لوگ میرے پاس آئیں۔ مجھے فون کردیا ہوتا میں خود ہی حاضر ہوجاتا۔'' اس نے انہیں راستہ دیتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں نیازی صاحب، ہمیشہ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے۔''

''اور یہ محمود، فاروق اور فرزانہ ہی ہیں نا۔'' اس نے حد درجے خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں، اور بھئی، یہ امتیاز نیاز ہیں، نقشے بنانے کے ماہر۔ شہر

میں ان کے پائے کا کوئی ماہر نہیں۔''

''آپ مجھے گنہ گار کر رہے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے نقشہ نیازی کے سامنے رکھ دیا۔

''اس نقشے کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''ابھی بتائے دیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر اس کی نظریں اس نقشے پر جم گئیں۔ اچانک انہوں نے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتے دیکھیں۔ پھر چہرے پر مسکراہٹ تیرتی نظر آئی۔

''خیر تو ہے، آپ کچھ حیران پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

''جی ہاں، دراصل یہ نقشہ میں نے بنایا تھا۔'' نیازی بولا۔

''کیا؟'' ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

☆☆☆
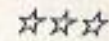
سراغ نکل آیا

ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، پھر انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے:

''یہ نقشہ آپ نے بنایا تھا، لیکن کب؟ یہ تو ہمیں ایک کنویں سے ملا ہے اور وہ بھی ایک انسانی لاش کے ساتھ۔''

''اوہ۔'' نیازی کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

''جی ہاں، مہربانی فرما کر جلدی سے بتائیے، آپ نے یہ نقشہ کب اور کن حالات میں بنایا تھا۔''

''یہ آج سے شاید دو یا اڑھائی سال پہلے کی بات ہے۔ ایک صاحب میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک مزاحیہ فلم بنا رہے ہیں اور یہ کہ وہ فلم ساز ہدایت کار ہیں۔ مزاحیہ فلم کی کہانی ایک خزانے کے گرد گھومتی ہے، لہذا میں ایک خزانے کا نقشہ بنا دوں۔'' نیازی نے انہیں بتایا۔

''اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ نقشہ کس قسم کا ہونا چاہیے۔''

انسپکٹر جمشید آگے کو جھک آئے۔

''جی ہاں۔ اس نے کہا تھا، فلم کی کہانی ایک حویلی سے تعلق رکھتی ہے۔ حویلی کے گرد ایک چاردیواری ہے اور چار دیواری میں پچھلی طرف ایک کنواں ہے۔ خزانہ اس کنویں میں ہے، بس اس کے مطابق نقشہ بنادیں۔ میں نے یہ کام اس کے بیٹھے بیٹھے ہی کر دیا تھا۔ اس نے مجھے اتنے سے کام کے پانچ سو روپے دیے تھے۔'' نیازی نے بتایا۔

''تو کیا آپ اس آدمی کا حلیہ بھی بتا سکتے ہیں؟'' محمود پر جوش لہجے میں بولا۔

'حلیہ، بات دو اڑھائی سال پہلے کی ہے۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف کوئی خاص توجہ بھی نہیں دی تھی۔ شاید میں درست نہ بتا سکوں، پھر بھی جہاں تک مجھے یاد ہے، اس آدمی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ جیسے فلمی ہیروؤں کے ہوتے ہیں اور وہ پتلا دبلا سا تھا، بس مجھے اور کچھ یاد نہیں آرہا۔''

''ذہن پر زور دیجیے، چہرے کے نقش و نگار بتانے کی کوشش کیجیے۔ یہ ایک انسانی قتل کا معاملہ ہے۔''

''جی بہتر'' میں سوچتا ہوں۔'' اس نے کہا اور سر جھکا دیا۔ کافی دیر بعد سر اٹھا کر بولا:

''مجھے صرف اتنا یاد آتا ہے کہ اس کا چہرہ بھرا بھرا سا تھا۔''

''خیر، آپ پھر بھی یاد کرنے کی کوشش کرتے رہیے گا۔ ہو سکتا

ہے، میں آپ کو اپنے ساتھ لے جا کر دو ایک آدمیوں کے چہرے دکھاؤں۔''

''میں ہر وقت تیار ہوں۔''

وہ وہاں سے نکل کر پھر جیپ میں سوار ہوئے۔

''کیوں بھئی، کیا ابھی تک کوئی آدمی لمبے بالوں اور بھرے بھرے چہرے والا نظر آیا ہے۔ تمہیں؟'' انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

''لمبے بال تو ابھی تک کسی کے بھی نظر نہیں آئے۔ ایاز راؤ کا چہرہ بھرا بھرا ضرور ہے اور سردار تیمور کا چہرہ بھی پتلا دبلا نہیں ہے، لیکن اسے بھرا بھرا نہیں کہا جا سکتا۔'' محمود بولا۔

''تم نے شاید غور نہیں کیا۔ نیازی نے بتایا ہے کہ وہ ایک لمبے بالوں والا پتلا دبلا آدمی تھا، البتہ اس کا چہرہ بھرا بھرا تھا۔ اب غور کرو۔''

''جی نہیں، ان دونوں میں سے اس حلیے پر کوئی فٹ نہیں بیٹھتا۔'' محمود نے انکار میں سر ہلایا۔

''ضرور نہیں کہ تم ان دونوں کے ہی چہروں کو دھیان میں لاؤ۔ ان کے ملازموں اور ایاز راؤ کی دعوت میں آنے والے لوگوں کے چہرے بھی یاد کرنے کی کوشش کرو۔'' انہوں نے کہا۔

''ان کے ملازم۔ سردار تیمور کے تین ملازم ہیں۔ ہم ان تینوں سے مل چکے ہیں۔ یہ اس زمانے میں بھی ملازم تھے، جب ان کی بیگم

نازلی اور نگ غائب ہوئی تھی، لیکن ان میں سے کسی کے بھی بال لمبے نہیں ہیں، نہ چہرہ بھرا بھرا ہے، ہاں تینوں دبلے پتلے ضرور ہیں۔''

''اور ایاز راؤ کے ملازم؟'' انسپکٹر جمشید نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''ان کے ہاں ہمیں صرف دو ملازم نظر آئے تھے۔ ان دونوں کے قد قدرے لمبے ہیں۔ وہ اتنے بوڑھے بھی نہیں ہیں۔ ہاں چہرے ضرور بھرے بھرے ہیں۔''

''بھئی بالوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے، وہ تو کسی وقت بھی کٹوائے جاسکتے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے: ''خیر ہم حویلی چل ہی رہے ہیں۔ میں خود ہی دیکھوں گا۔''

حویلی پہنچے تو وہاں موت کی خاموشی طاری تھی۔ دستک کے جواب میں جس ملازم نے دروازہ کھولا۔ انہیں اس کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال نظر آئے۔ چہرہ ضرور بھرا بھرا تھا، لیکن اتنا نہیں کہ خصوصیت سے اس کا ذکر کیا جائے۔ ہاں وہ ایک پتلا دبلا آدمی ضرور تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کو دیکھ کر ملازم نے فوراً اندر داخل ہونے کے لیے راستہ دے دیا۔

''انکل ایاز کہاں ہیں؟'' محمود نے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں۔''

''وہ ملازم کے پیچھے چلتے ہوئے ایاز راؤ کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ ایک صوفے میں دھنسے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ ان کے

قدموں کی آواز سن کر چونک اٹھے اور پھر انسپکٹر جمشید کو دیکھ کر جلدی سے کھڑے ہوگئے۔

''اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ انسپکٹر جمشید ہیں۔''

''آپ نے ٹھیک پہچانا۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔

''مجھے اس واقعے کا پتا چلا تو رہا نہیں گیا۔ میں ذرا اس تہہ خانے کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور دیکھیے، ویسے مجھے اس واقعے نے پریشان کردیا ہے۔ حویلی میں پہلا ہی دن اس قدر پریشان کن ثابت ہوا تو آگے چل کر نہ جانے کیا ہوگا۔''

''وہم کرنے کی ضرورت نہیں، سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''آیئے، میں آپ کو تہہ خانہ دکھاؤں۔''

وہ ان کے ساتھ تہہ خانے میں داخل ہوئے۔ ایک بار پھر ان کے دماغ بدبو کی وجہ سے پھٹنے لگے۔ انسپکٹر جمشید ان سوراخوں کے پاس جا کر چند لمحے تک کھڑے رہے، آخر واپس مڑے۔

''آیئے، واپس چلیں۔ اب اس جگہ کو بھی کھود کر دیکھنا ہوگا۔''

''جی کیا مطلب؟'' ایاز راؤ چونکے۔ ان کے چہرے پر خوف دوڑ گیا۔

''میں اس تہہ خانے میں انسانی مردے کی بو محسوس کررہا ہوں اور

یہ تو ان تین سوراخوں کے ذریعے آ رہی ہے۔''

''اوہ۔'' ایاز راؤ دھک سے رہ گئے۔

''اوپر پہنچ کر انسپکٹر جمشید نے اپنے عملے کے کچھ آدمیوں کو فون کیا۔ ان کے آنے پر ان میں سے کچھ کو تو کنویں اور کنویں سے نکلنے والے ملبے پر مقرر کیا اور دو کو تہہ خانے کے دروازے پر۔ انہیں ہدایت دی کہ وہ رات بھر نگرانی کریں گے۔ کھدائی کا کام انہوں نے اگلے دن پر رکھا تھا۔

دوسرے دن انہیں اسکول سے چھٹی تھی، اس لیے وہ بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ ہی پہنچ گئے۔ ان سوراخوں کے پاس سے کھدائی شروع ہوئی اور آخر ایک گھنٹے تک کدالیں چلنے کے بعد انہیں ایک انسانی پنجر مل گیا۔ اس پر کسی حد تک گوشت ابھی تک موجود تھا۔ پنجر کو باہر لایا گیا۔ ایاز راؤ اور عرفان اسے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے۔ چہرے کے نقوش ابھی اس قابل تھے کہ شناخت کیا جا سکے۔

''کیوں جناب، آپ اس چہرے کو پہچانتے ہیں؟''

''ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے میں نے یہ چہرہ دیکھا ہوا ہو۔'' ایاز راؤ نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''خیر، اپنے دوست سردار تیمور کو فون کریں۔ ہم یہ پنجر انہیں بھی دکھائیں گے۔ ہو سکتا ہے، وہ اسے پہچان لیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی بہتر۔'' انہوں نے کہا اور فون کرنے چلے گئے۔

اب ملبے کی چھنائی کا کام شروع ہوا۔ عملے کو ہدایات دی گئی تھیں کہ انہیں ملبے میں ایک پستول تلاش کرنا ہے۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید کی نظریں کنویں کے سامنے حویلی کے کمرے پر پڑیں۔ انہوں نے چونک کر کہا:

''محمود، ذرا اپنے دوست عرفان کو تو بلانا۔''

''جی اچھا۔'' اس نے کہا اور اندر کی طرف دوڑ گیا۔ جلد ہی عرفان کے ساتھ واپس آیا۔

''جی انکل، کیا حکم ہے۔''

''بھئی، سامنے جو کمرہ ہے، کیا تہہ خانہ اسی کمرے میں نہیں ہے۔''

''میرا خیال ہے، اسی کمرے میں ہے۔'' اس نے کہا۔

''صرف خیال سے کام نہیں چلے گا۔ اچھا اپنے ابو کو بلا لائیں۔''

''جی بہتر۔'' اس نے کہا اور چلا گیا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے ابا جان کہ تہہ خانہ اس کمرے کے نیچے ہے یا کسی اور کمرے کے نیچے۔'' فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

''تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ کنواں اس کمرے کے بالکل سامنے ہے۔'' محمود نے اسے گھورا۔

''اوہ۔'' فاروق اور فرزانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، کیونکہ وہ محمود کی بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ اسی وقت ایاز راؤ آتے

نظر آئے۔

''جی ہاں، تہہ خانہ اسی کمرے کے نیچے واقع ہے۔''

''اور یہ کمرہ کنویں کے بالکل سامنے ہے۔'' انہوں نے پرجوش آواز میں کہا، پھر مزدوروں کو آواز دی۔

''یہ کام فی الحال چھوڑ دو اور اس کنویں کی مزید کھدائی کرو۔''

''یا اللہ رحم، یہ کس لیے؟'' ایاز راؤ نے پریشان ہو کر کہا۔

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کریں۔''

مزدور کنویں میں اتر گئے۔ اس کے لیے انہیں سیڑھی لگانا پڑی۔ سیڑھی وہاں پہلے ہی موجود تھی۔ لاش برآمد ہونے سے پہلے ہی مزدور سیڑھی استعمال کر رہے تھے۔ زور شور سے کھدائی ہونے لگی۔ اتنے میں سردار تیمور اور فوزیہ آتے نظر آئے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ نزدیک پہنچنے پر انہوں نے دیکھا کہ کنویں میں اور کھدائی ہو رہی ہے تو بہت حیران ہوئے۔

''یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟'' سردار تیمور ہکلا کر بولے۔

''مزید کھدائی ہو رہی ہے۔ آئیے پہلے آپ اس پنجر کو دیکھ لیں۔''

وہ انہیں اندر لائے، جہاں پنجر رکھا گیا تھا۔ اس پر سے کپڑا ہٹا دیا گیا۔

''اسے غور سے دیکھیے، چہرے کے نقوش ابھی اس قابل ہیں کہ

اسے پہچانا جا سکے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں، یہ شخص کون تھا؟'' ان کی آواز کمرے میں اس طرح گونجی، جیسے کسی مقبرے میں آواز گونجتی ہے۔

سردار تیمور نے اس چہرے پر نظریں جما دیں۔ چند لمحے تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے، پھر بولے:

''نہیں جناب، میں نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا۔''

''ہوں، اس نقشے کو دیکھا ہے کبھی آپ نے۔'' انہوں نے نقشہ جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ انہوں نے نقشے کو بھی غور سے دیکھا اور پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

''یار سردار تیمور، یہ تم نے کیسی حویلی میرے ہاتھ فروخت کی ہے، جس میں سے دو دو لاشیں نکل آئیں۔'' ایاز راؤ نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نے۔ میں نے فروخت کی ہے۔ ایاز غلط بیانی سے کام نہ لو۔ میں حویلی بیچنے پر ہرگز تیار نہیں تھا۔ میں تو بس اس کی رہائش چھوڑ کر نئی کوٹھی میں جانا چاہتا تھا۔ تم نے زور دیا تو میں نے حویلی فروخت کر دی۔'' سردار تیمور بولے۔

''اب مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے خرید کر میں پریشانی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔'' ایاز راؤ نے تلملا کر کہا۔

''تو پھر اب بھی کیا بگڑا ہے۔ تم اپنی رقم واپس لے لو۔ حویلی میں ہی رکھ لوں گا اپنے پاس۔'' سردار تیمور نے بھی غصیلی آواز میں کہا۔

''آپ دونوں ایک دوسرے سے نہ جھگڑیں، کیونکہ حویلی کی فروخت کے معاملے میں دونوں ہی قصوروار نہیں ہیں، تو ایاز راؤ صاحب، حویلی آپ نے زور دے کر خریدی تھی اور سردار تیمور اسے فروخت کرنے پر تیار نہیں تھے۔''

''جی، جی ہاں، یہ سچ ہے۔'' اس نے چور نظروں سے سردار تیمور کی طرف دیکھا۔

''ذرا میرے ساتھ آیئے۔'' انسپکٹر جمشید نے ایاز راؤ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اور پھر انہیں دور ایک درخت کے نیچے لے گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی ساتھ چلے آئے۔

''آپ اس حویلی کو کیوں خریدنا چاہتے تھے۔ آپ کو اس سے کیا دلچسپی تھی؟''

''مم۔ میں۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس حویلی کو خریدوں گا۔ دراصل سردار تیمور کی بیگم نازلی اورنگ کی گمشدگی نے مجھے یہ حویلی خریدنے پر مجبور کیا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔

''مطلب یہ کہ میں بہت الجھن محسوس کرتا رہا۔ کہ آخر نازلی اورنگ کہاں چلی گئی۔ سردار تیمور کو اپنی بیوی سے اور بیوی کو اپنے خاوند سے بے تحاشا محبت تھی اور ان دونوں کو اپنی بیٹی فوزیہ سے بے حد پیار تھا۔ ان حالات میں نازلی اورنگ کی گم شدگی میرے لیے حیران کن معاملہ

تھا۔ ایسے میں میں نے اس حویلی میں سردار تیمور کے ساتھ گھومتے ہوئے اکثر اس کنویں کو دیکھا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پولیس نے اس کنویں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی، حالانکہ میں چاہتا تھا کہ کنویں کو کھود کر دیکھا جائے اور اب سردار نے نئی کوٹھی بنوانا شروع کی تو میں نے اس حویلی کو خریدنے کا پروگرام بنایا۔ پہلے میں نے اسے خریدا اور پھر آس پاس کی کچھ زمینیں بھی خرید لیں۔ اس کے بعد اس کنوئیں کی صفائی کا پروگرام بنایا۔ دراصل میرے ذہن میں یہی خیال اچھل مچا رہا تھا کہ کہیں نازلی اورنگ اس کنویں میں تو دفن نہیں اور میرا خیال سچ ثابت ہوا۔'' ایاز راؤ کہتے چلے گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی حیرت میں اضافہ ہونے لگا۔

''تو پارٹی سے ایک دن پہلے آپ نے اس خیال سے کھدائی شروع کرائی تھی، تاکہ لاش نکلے تو سب کے سامنے نکلے۔''

''جی ہاں۔'' انہوں نے کہا۔

''کیا آپ کا خیال ہے نازلی اورنگ کو آپ کے دوست سردار تیمور نے ہلاک کیا ہے؟''

''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا، لیکن شاید یہی بات ہو۔''

''ہوں۔ سوال یہ ہے کہ انہیں نازلی کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی، جب کہ وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتے تھے اور وہ ان سے کرتی تھی۔ ویسے یہ نازلی کس قسم کی عورت تھی؟''

''وہ ایک غیر ملکی عورت تھی۔ بڑے بڑے لوگوں کی دعوتوں میں شامل ہونے کی حد درجے شوقین تھی۔ ہفتے میں چار پانچ دن شام سے لے کر رات گئے تک پارٹیوں میں شریک رہتی تھی۔''

''اور کیا سردار تیمور بھی اس کے ساتھ جایا کرتے تھے؟''

''بہت کم، عام طور پر وہ تنہا ہی جاتی تھی۔''

''اور سردار تیمور اس کے جانے پر اعتراض نہیں کرتے تھے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی بیوی غیر ملکی ہے اور ان کے ہاں کا ماحول ہی ایسا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر انہوں نے نازلی پر پابندیاں عائد کیں تو وہ ناراض ہوکر کہیں اپنے ملک نہ چلی جائے۔''

اسی وقت ایک مزدور دوڑتا ہوا آیا:

''وہ۔ وہ جناب۔ سوراخ نکل آیا ہے۔'' اس نے ہکلا کر کہا۔

☆☆☆

''اوہ۔'' انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا اور وہ کنویں کی طرف لپکے۔

''سوراخ نکل آیا۔'' فاروق نے بوکھلا کر کہا اور اس نے بھی ان کے پیچھے قدم اٹھا دیے، پھر وہ سب کنویں پر پہنچ گئے۔

انہوں نے دیکھا، کنویں میں تہہ خانے والے کمرے کی طرف ایک سوراخ نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید مسکرائے اور بولے:

''بس میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔''

''جی کیا مطلب۔ کیا دیکھنا چاہتے تھے آپ؟'' محمود نے جلدی سے کہا۔

''دونوں لاشیں دراصل کنویں میں ہی دبائی گئی تھیں۔ اس وقت جو پنجر ملا ہے، وہ پہلے دبایا گیا تھا، پھر نازلی اورنگ کو قتل کیا گیا تو اسے بھی اسی کنویں میں دفن کیا گیا۔ تہہ خانے میں موجود چوہوں نے پچھلی لاش تک سوراخ کر دیے اور یہ بو تہہ خانے میں آنے لگی۔''

''اوہ، تو یہ بات تھی۔'' فرزانہ نے لمبا سانس کھینچا۔

''لیکن سوال یہ ہے کہ دوسرا شخص کون ہے اور ان دونوں کو کس نے ہلاک کیا؟'' محمود بولا۔

''یہی ہمیں معلوم کرنا ہے۔ چلو بھئی، پہلا کام شروع کر دو، یعنی بے سے پستول کی تلاش کا کام۔''

''پستول کی تلاش۔ کیا مطلب؟'' سردار تیمور نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں، ہمیں امید ہے۔ قاتل نے پستول بھی کنویں میں ہی چھوڑ دیا ہوگا۔'' انہوں نے کہا۔

پستول کی تلاش شروع ہوگئی۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید سردار تیمور کی طرف مڑے۔

''آپ کے پاس اپنی بیوی کی کوئی تصویر ہوگی۔''

''جی ہاں، لیکن زندہ تصویر، کاغذ والی نہیں۔'' وہ بولے۔

''زندہ تصویر۔اوہ، میں سمجھا۔ آپ کا مطلب اپنی بیٹی سے ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی ہاں، اس کی صورت اپنی ماں سے بہت زیادہ ملتی ہے۔''

''اور آپ کی بیوی کے والد کی کوئی تصویر ہے آپ کے پاس؟''

''جی نہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''اچھا، ان کا حلیہ کیا تھا؟''

''ان کا حلیہ، وہ ایک پتلے دبلے آدمی تھے۔ سر کے بال بہت لمبے تھے۔ چہرہ بھرا بھرا سا تھا۔'' انہوں نے حلیہ بتایا اور ان کی حیرت میں بلا کا اضافہ ہوگیا، کیونکہ بالکل یہی حلیہ امتیاز نیازی نقشے کے ماہر نے بتایا تھا۔

☆☆☆

سوچ کا سمندر

''یہ تو آپ نے بہت حیران کن بات سنائی۔'' انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

''جی، وہ کیسے؟'' سردار تیمور نے حیران ہوکر کہا۔

''تقریباً اڑھائی سال پہلے انہوں نے ایک نقشہ نویس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ یہ نقشہ انہوں نے ہی اس سے بنوایا تھا اور نقشہ بنوانے کی وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ ایک فلم ساز اور ہدایت کار ہیں۔ ایک مزاحیہ فلم بنا رہے ہیں، جس کی کہانی ایک خزانے کے گرد گھومتی ہے، چنانچہ نقشہ نویس نے انہیں یہ نقشہ بنا کر دیا تھا۔ اب یہی نقشہ اس کنویں سے ملا ہے۔ نقشہ نویس نے بھی بالکل یہی حلیہ بتایا تھا جو آپ اپنے سسر کا بتا رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے جیب سے نقشہ بھی نکال کر انہیں دکھایا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب، نازلی اورنگ کے والد تو حویلی فروخت کرنے کے چند ہفتے بعد میری اور نازلی کی شادی کرتے ہی

یہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔'' سردار تیمور نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں، نقشہ نویس نے یہی حلیہ بتایا تھا، جو آپ نے بتایا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے۔

''خدا ہی بہتر جانتا ہے، یہ کیا چکر ہے۔'' سردار تیمور بڑبڑائے۔

''آپ کام کیا کرتے ہیں؟'' فرزانہ پوچھ بیٹھی اور انسپکٹر جمشید دھیرے سے مسکرا دیے۔ واقعی انہوں نے ابھی تک یہ تو معلوم کیا ہی نہیں تھا کہ سردار تیمور کیا کام کرتے ہیں۔

''اس شہر کا کھالوں کا سب سے بڑا تاجر ہوں۔''

''ہوں، اور آپ کے دوست ایاز راؤ کیا کام کرتے ہیں؟''

''ان کی آٹے کی مل ہے۔'' ان کی بجائے محمود بول اٹھا۔

''ہوں خیر، میں دیکھوں گا کہ آخر چکر کیا ہے۔ ویسے کیا آپ ہمیں کوئی اور بات بتانا چاہتے ہیں؟''

''میں تو پہلے ہی آپ لوگوں کے سوالات کے جواب دے چکا ہوں۔'' سردار تیمور نے بے چارگی کے انداز میں کہا۔

''اوہو، آپ تو بہت دیر سے کھڑے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اندر کسی کمرے میں بیٹھ جائیں۔ آپ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پڑی تو ہم خود حاضر ہو جائیں گے۔ دراصل آپ کو اس دوسری لاش کو شناخت کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔''

''اگر ہمارا یہاں ٹھہرنا ضروری ہے تو ہم اندر جا کر بیٹھ جاتے

ہیں، ورنہ واپس چلے جاتے ہیں۔''

''میں چاہتا ہوں، آپ اس ملبے کے چھٹنے تک اور ٹھہر جائیں۔'' انہوں نے کہا۔

''اچھی بات ہے، ہم اندر ڈرائنگ روم میں موجود ہیں۔'' یہ کہہ کر سردار تیمور فوزیہ کے ساتھ اندر کی طرف چلے گئے۔

اب وہ ایاز راؤ کی طرف بڑھے۔

''کیوں جناب، کیا آپ نے کبھی اورنگ شاکو نہیں دیکھا تھا؟''

''بس ایک دو مرتبہ۔''

''آپ نے دوسری لاش تو دیکھ لی ہے؟'' انہوں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، دیکھ چکا ہوں۔''

''وہ لاش کس کی ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں؟''

''جی نہیں، میں اسے نہیں پہچان سکا۔ نقوش اتنے واضح بھی نہیں ہیں۔''

''ہوں ٹھیک ہے، ہم دو ایک فون کرنا چاہتے ہیں۔''

''اندر تشریف لے جائیے اور جتنے چاہے، فون کیجیے۔ کہیے تو میں بھی ساتھ چلوں۔''

''جی نہیں، آپ کو ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ آؤ بھئی، تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔''

اٹھایا۔

''ہیلو، انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ اود شاہی، کہو کیا رپورٹ ہے۔''
انہوں نے کہا اور تقریباً ایک منٹ تک دوسری طرف کی بات سنتے رہے،
پھر ریسیور رکھتے ہوئے بولے:

''سردار تیمور کھالوں کے کاروبار میں واقعی شہر میں سب سے بڑے
تاجر ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ بہت ہی ایمان دار، نیک،
دین دار اور ملک اور قوم کے معاملات میں دلچسپی لینے والے اور دوسروں
کی خدمت کرنے والے آدمی ہیں۔''

''اوہ، ایسے آدمی قاتل کس طرح ہو سکتے ہیں۔'' محمود نے پریشان
ہو کر کہا۔

''تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔'' فرزانہ نے اسے
گھورا۔

''یہ کہ ہم قاتل کو کس طرح تلاش کریں گے۔ ابھی تک تو ہم
بھی خیال کرتے رہے کہ سردار تیمور ہی قاتل ہیں۔''

''تم خیال کرتے رہے ہو گے۔ میں نے تو یہ بات ایک بار بھی
نہیں سوچی۔'' فرزانہ نے منہ بنایا۔

''ہاں، یہ تو ایاز راؤ کو قاتل خیال کرتی رہی ہے۔'' فاروق نے
جلدی سے کہا۔

''نہیں، میں نے انہیں بھی قاتل خیال نہیں کیا۔''

''ایاز راؤ کے بارے میں رپورٹ یہ ہے کہ وہ بھی بہت ایمان
دار اور کاروباری آدمی ہیں، لیکن اس حد تک مشہور نہیں جتنے کہ
سردار تیمور۔ وہ تو بہت ہی زیادہ مشہور ہے اور ان کی عزت بھی
حد درجے ہے۔ بڑے بڑے آفیسر حضرات ان سے ملنا پسند کرتے ہیں
اور ان کی دعوت کرنا پسند کرتے ہیں۔''

''پھر اب ہم کیا کریں گے؟'' فرزانہ بولی۔

''ہم تفتیش کریں گے، آؤ باہر چل کر دیکھیں، پستول ملا یا نہیں۔''
وہ باہر نکلے ہی تھے کہ اکرام آتا نظر آیا۔ آتے ہی بولا:

''اس لاش کے جسم سے بھی اسی پستول سے چلائی گئی گولی نکلی
ہے۔ یہ لاش پہلی لاش کی نسبت کچھ دن یا کچھ ماہ پرانی ہے۔''

''اور کچھ۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی بس، یہی رپورٹ ہے۔ اسے بھی پیٹ میں گولی ماری گئی
تھی۔'' اکرام نے کہا۔

اسی وقت ایک مزدور دوڑتا ہوا آیا۔ قریب آ کر اس نے کہا:

''پستول مل گیا ہے جناب۔''

''اوہ۔'' انہوں نے ایک ساتھ کہا اور پھر کنویں کی طرف لپکے۔

☆☆☆

کنویں کے پاس پہنچ کر انہوں نے دیکھا، پستول مٹی سے جھانک
رہا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے اسے اٹھالیا۔ اتنا عرصہ مٹی میں دبے رہنے کے

بعد اس پر انگلیوں کے نشانات ہونے کا سوال ہی نہیں تھا، لہٰذا انہوں نے احتیاط نہیں کی۔

پستول ننھا سا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ مٹی نے اس کا رنگ روپ اڑا کر رکھ دیا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے اسے رومال اور چاقو سے صاف کیا تو اس کے نمبر نظر آنے لگے۔

''میرا خیال ہے، ہم اس کے خریدار کا نام معلوم کرسکیں گے۔'' وہ بڑبڑائے۔

''لیکن ابا جان، شہر میں تو اسلحہ کی بہت دکانیں ہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''بھئی، یہ نمبر دیکھ کر کئی آدمیوں کو اس کام پر لگایا جاسکتا ہے۔''

انہوں نے اکرام کے ذمے پستول کے خریدار کا نام معلوم کرنے کی ڈیوٹی لگائی۔ اکرام فوری طور پر حرکت میں آگیا۔ دو گھنٹے بعد آخر اسلحے کا وہ ڈیلر مل ہی گیا، جس نے پستول فروخت کیا تھا۔ اور اکرام نے آکر بتایا۔

''پستول آج سے ٹھیک دو سال دو ماہ پہلے خریدا گیا تھا۔ خریدنے والے نے اپنا نام اورنگ شا لکھوایا تھا۔ دکاندار نے اس کا حلیہ بھی نوٹ کیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ایک لمبے سر والا، درمیانے سے قد کا پتلا دبلا آدمی تھا، البتہ اس کے گال بھرے بھرے تھے۔''

''اوہ۔'' وہ حیران رہ گئے۔

''اس کا مطلب ہے، پستول نازلی اورنگ کے والد نے خریدا تھا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''ابا جان، کنویں سے ہمیں جو دوسری لاش ملی ہے، اس کے بال بھی تو لمبے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ گال بھرے بھرے نہیں ہیں۔ وہ مرنے کے بعد ہو بھی نہیں سکتے۔ ہاں بال مرنے کے کافی عرصہ بعد تک ضائع نہیں ہوتے۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ دوسری لاش اورنگ شا کی ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی ہاں۔''

''ہوسکتا ہے، یہی بات ہو، لیکن ابھی ہم یقین سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔'' وہ بولے۔

''اس کا مطلب ہے، پستول کے مالک کا نام معلوم ہوجانے کے بعد بھی ابھی تک ہم کچھ نہیں جان سکے۔'' محمود نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، یہی بات ہے۔ کیس کافی الجھا ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے کہ اڑھائی سال پرانا ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے، پھر اکرام کی طرف مڑے:

''اکرام، تم ایک بات بتانا بھول گئے۔ یہ کہ کیا دونوں گولیاں ایک جیسی ہیں اور اسی پستول سے چلائی گئی ہیں۔''

''جی ہاں، اس میں کوئی شک نہیں۔'' اس نے فوراً کہا۔

''یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ اورنگ شاکو وہ نقشہ بنوانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں کوئی خزانہ نہیں تھا اور یہ چکر خزانے کا نہیں ہے۔'' فاروق نے بہت دیر بعد زبان ہلائی۔

''ہاں، یہ تم نے کام کی بات کہی ہے کہ اسے یا جو کوئی بھی تھا، اسے نقشہ بنوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اوہو، ٹھہرو بھئی۔'' انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔ پھر انہوں نے پراسرار انداز میں کہنا شروع کیا:

''دوسری لاش نازلی اورنگ سے چند ہفتے پہلے کی ہے، کیونکہ کنویں کے نچلے حصے میں دفن تھی، نازلی کو بعد میں ہلاک کیا گیا۔ یعنی چند ہفتے بعد ہمارے پاس پستول خریدنے کی تاریخ موجود ہے۔ پستول دوسال دو ماہ پہلے خریدا گیا تھا۔ شاید امتیاز نیازی نے نقشہ بنا کر دینے کی تاریخ اپنے پاس لکھی ہو۔ ٹھہرو، میں اسے فون کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھے۔ انہوں نے جلدی جلدی امتیاز نیازی کے نمبر ڈائل کیے اور پھر چند سیکنڈ تک اس سے بات کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا اور ان کی طرف مڑے:

''میرا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ نقشہ آج سے ٹھیک دو سال پہلے بنوایا گیا تھا۔

''جی کیا مطلب؟'' وہ چونک اُٹھے۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق دوسری لاش آج سے دو

سال چند ہفتے پہلے کی ہے۔ پستول ٹھیک دو سال پہلے خریدا گیا تھا۔ اب اگر یہ لاش اورنگ شا کی ہے تو پھر نقشہ اس نے نہیں، اس کے میک اپ میں کسی اور نے بنوایا تھا، کیونکہ وہ تو اس وقت کنویں میں دفن ہو چکا تھا، لیکن اس وقت کنویں میں نازلی اورنگ کی لاش نہیں تھی۔ اسے دو سال پہلے ہلاک کیا گیا تھا۔ یعنی نقشہ بنوانے کے بعد۔

''اس ساری تفصیل کے باوجود ابھی تک ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آسکا، آخر کسی کو نقشہ بنوانے کی کیا ضرورت تھی۔'' محمود الجھن کے عالم میں بولا۔

''اس پر ہمیں غور کرنا ہوگا۔ یہ کیس دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دے گا۔ چلو گھر چلیں۔ وہاں شام کی چائے پی کر ہم سوچنا شروع کریں گے۔'' انہوں نے کہا اور اٹھ کر کھڑے ہوگئے، پھر جیپ میں بیٹھتے ہوئے بولے:

''تہہ خانے کی بُو کا اگرچہ راز حل ہو چکا ہے، لیکن وہ بُو ابھی تک مجھے پریشان کر رہی ہے، نہ جانے کیوں۔''

''ہمیں تو یہ سارا کیس ہی پریشان کر رہا ہے۔'' فاروق نے بھنا کر کہا۔ اور اکرام ہنس پڑا۔

''مہربانی فرما کر تم پریشان نہ ہو، ہم خود ہی اس پر غور کر لیں گے۔'' فرزانہ طنز بھرے لہجے میں بولی۔

''شکریہ، میں عقل سے پیدل نہیں ہوں۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''اچھا، یہ بات ہمیں آج ہی معلوم ہوئی۔''

''مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے ہم اس کیس کی تہ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔'' محمود نے ان کے جملوں کی طرف توجہ دیے بغیر کہا۔

''تمہارے محسوسات ہم پر لاگو نہیں ہیں۔'' فرزانہ نے منہ بنایا۔

''گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اس کیس کو حل کر لو گی۔'' محمود نے اسے گھورا۔

''کیوں نہیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے عقل سے نوازا ہے۔''

''تو اس کا شکر ادا کرو۔'' فاروق نے جلدی سے کہا۔

''وہ تو میں ہر وقت کرتی ہوں۔ تمہاری طرح ناشکری نہیں ہوں۔''

''بھئی جھگڑو نہیں۔ ویسے میں بھی محمود کا ہم خیال ہوں۔''

''جی، کس معاملے میں۔'' فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

''یہی کہ تم لوگ اس کیس کی تہ تک نہیں پہنچ سکو گے۔'' وہ مسکرائے۔

''ابا جان، یہ آپ کہہ رہے ہیں۔''

''کیوں بھئی اکرام، یہ جملہ تم نے تو نہیں کہا؟'' انسپکٹر جمشید اس کی طرف پلٹے۔ وہ جیپ چلا رہا تھا۔

''جی نہیں تو، میں تو جیپ چلا رہا ہوں۔'' اس نے بوکھلا کر کہا اور وہ مسکرا دیے۔

''یعنی آپ کا کہنا یہ ہے کہ ہم اس کیس کی تہ تک نہیں پہنچ

سکتے۔ یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ قاتل کون ہے اور معاملہ کیا ہے۔'' فرزانہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میرا یہی خیال ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''اگر میں نے یہ کیس حل کر دیا تو آپ کیا انعام دیں گے؟''

''ایک ہزار روپے۔''

''ویری گڈ، فاروق تم کیا کہتے ہو؟''

''ایک ہزار روپے حاصل کرنے کے لیے تو میں اپنے دماغ کی دوڑ ضرور لگاؤں گا۔ فاروق نے جلدی سے کہا۔ اکرام پھر ہنسا۔

''میں بھی ایسا ہی کروں گا، لیکن محمود ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ تو پہلے ہی ہمت ہار چکا ہے۔''

''بے وقوف ہو تم۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا اور تم سے پیچھے نہیں رہوں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ یہ مقابلہ تم تینوں کے درمیان ہے۔ جو کامیاب ہوگا۔ انعام اسے میری طرف سے ملے گا۔''

''ٹھیک ہے ابا جان، لیکن اگر ہم تینوں نے ہی کیس حل کر لیا تو؟''

''بھئی، میں کنجوس نہیں ہوں، اس صورت میں ایک ہزار روپے تم تینوں میں تقسیم کر دوں گا۔'' انہوں نے شوخ آواز میں کہا۔

''یہ تو کوئی مزے دار بات نہ ہوئی۔'' فرزانہ نے مایوسانہ انداز

میں کہا۔

''اچھا تو، ایک ایک ہزار روپے دے دوں گا۔''

''ہاں، اب کچھ بات بنی۔ انکل اکرام، ذرا جیپ کی رفتار بڑھا دیں۔ ہم جلد از جلد گھر پہنچ کر سوچ کے سمندر میں غرق ہو جانا چاہتے ہیں۔''

''وہ تو آپ جیپ میں بھی ہو سکتے ہیں۔'' اکرام مسکرایا۔

''لیکن گھر پہنچ کر سمندر سے باہر بھی تو نکلنا پڑے گا۔ جب کہ ہم چاہتے ہیں، ایک بار غوطہ لگانے کے بعد اوپر نہ آئیں۔''

''تب تو غوطہ لگانے سے پہلے چائے بھی پی لینا۔ کہیں تمہاری امی میرے پیچھے نہ پڑ جائیں۔'' انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر کہا اور وہ مسکرا دیے۔

اور گھر پہنچ کر، چائے پی کر وہ واقعی سوچ کے سمندر میں اتر گئے۔

☆☆☆

تفصیل کا بیان

سوچ میں ڈوبے انہیں بہت دیر گزر گئی۔ تمام حالات اور واقعات اپنے ذہن میں دوڑا لیے۔ مگر تینوں کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ آخر محمود نے جھنجلا کر کہا:

''سنو بھئی، میرا خیال ہے، ہم اس طرح کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔''

''تو پھر بتاؤ نا، کس طریقے سے پہنچ سکتے ہیں۔''

''آپس میں بات چیت کر کے۔ حالات اور واقعات کو ایک دوسرے کے سامنے دہرا کر۔ اگر تم دونوں کو یہ تجویز منظور ہو تو میں اپنی معلومات کے مطابق سنانا شروع کرتا ہوں، پھر تم دونوں کی باری آئے گی۔''

''میرا خیال ہے، تجویز قابل قبول ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

اعتراض تو تمہیں اس صورت میں ہوتا، جب یہ تجویز میری طرف سے پیش ہوتی۔'' فاروق نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

''بھئی واہ، تم تو آج فرزانہ کے بھی کان کاٹ رہے ہو۔'' محمود مسکرایا۔

''توبہ کرو، فرزانہ اور میرے ذریعے کان کٹوا لے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''اچھا بھئی، تم کوشش کرو، میں ایک کام کر آؤں۔ آؤ اکرام تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

''کیا اس کیس کے سلسلے میں ہی کہیں جا رہے ہیں ابا جان۔'' فرزانہ نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں، یہی سمجھ لو۔'' وہ مسکرائے۔

''ہمیں نہیں بتائیں گے، کہاں جا رہے ہیں۔''

''بھئی تین ہزار روپے کا معاملہ ہے، میں کیسے بتا دوں۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔

''شکریہ، نہ بتائیے۔'' محمود بھی جواب میں مسکرایا اور وہ اکرام کے ساتھ چلے گئے۔

''کیا خیال ہے، ابا جان کہاں گئے ہیں؟'' فرزانہ بولی۔

''حویلی ہی جائیں گے اور اس کیس میں جانے کی جگہ رکھی ہی کہاں ہے۔'' فاروق نے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے محمود؟''

''میرا خیال ہے، وہ سردار تیمور سے ملنے جائیں گے۔ اس کیس میں سب سے زیادہ مشکوک آدمی سردار تیمور ہی ہیں۔''

''لیکن ان کے پاس جانے کی اب کیا ضرورت۔ ابھی ابھی تو وہ حویلی میں ہمارے ساتھ تھے۔'' فرزانہ بولی۔

''کوئی بات رہ گئی ہوگی۔ اسے پوچھنے کا خیال ابا جان کو اب آیا ہوگا۔''

''ہوں، خیر چھوڑو۔ چلو تم تفصیل کا بیان شروع کرو۔''

''تفصیل کا بیان، یہ اچھا نام ہے۔'' فاروق چونک کر بولا۔

''لیکن معاف کرنا، یہ کسی ناول کا نام نہیں بن سکتا۔'' فرزانہ نے چوٹ کی۔

''اگر تم لوگوں کا ارادہ فضول باتوں میں پڑنے کا ہے تو میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔''

''وہاں جا کر بھی تم کیا کر لوگے۔ خود ہی تو کہہ چکے ہو کہ اس طرح ہم شاید کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔''

''تو اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لو اور واقعات اور حالات دہرانا شروع کر دو۔ ہم سو فی صد سنجیدہ ہوئے جاتے ہیں۔'' فاروق نے واقعی سنجیدہ ہو کر کہا۔

''سو فیصد سنجیدہ اور تم۔'' فرزانہ بولی۔

''ہاں، آخر ہزار ہزار روپے حاصل کرنا ہیں۔''

''تو پھر سنو، آج سے تقریباً تیس سال پہلے سردار تیمور نے وہ حویلی ایک غیر ملکی شخص اورنگ شا سے خریدی تھی۔ اس شخص یعنی اورنگ شا کی ایک بیٹی بھی تھی۔ اس نے نہ صرف حویلی سردار تیمور کے ہاتھ فروخت کی، بلکہ اپنی بیٹی کی شادی بھی ان سے کردی اور خود سنی سنائی باتوں کے مطابق اپنے ملک چلا گیا۔ شاید اس نے حویلی اسی لیے فروخت کی تھی کہ وہ اپنے ملک جانا چاہتا تھا، لیکن اس کی بیٹی نے یہاں سے جانا پسند نہیں کیا، بلکہ اس نے سردار تیمور سے شادی کا پروگرام بنالیا، چنانچہ یہ شادی ہوگئی اور سردار تیمور کے بیان کے مطابق اورنگ شا یہاں سے چلا گیا۔ آج سے دو سال اور ٹھیک دو ماہ پہلے شہر کی ایک اسلحے کی دکان سے ایک چھوٹا سا پستول خریدا گیا۔ پستول خریدنے والے کا حلیہ دکاندار نے یہ بتایا کہ اس کے بال لمبے تھے۔ پتلا دبلا اور درمیانے قد کا آدمی تھا اور گال بھرے بھرے تھے۔ آج سے ٹھیک دو سال پہلے امتیاز نیازی نقشہ نویس سے اسی حلیے کے ایک آدمی نے ایک نقشہ یہ کہہ کر بنوایا کہ وہ ایک فلمساز ہے اور ایک مزاحیہ فلم بنا رہا ہے۔ اس فلم کی کہانی ایک خزانے کے گرد گھومتی ہے، لہٰذا اسے ایک ایسے نقشے کی ضرورت ہے جس میں ایک حویلی دکھائی گئی ہو اور حویلی کے گرد چار دیواری ہو۔ اس کے پچھلے حصے میں چاردیواری کے اندر ایک کنواں ہو اور خزانہ کنویں کے اندر ظاہر کیا جائے، چنانچہ امتیاز نیازی نے نقشہ بنادیا۔ اس سے

صاف ظاہر ہے کہ یہ چکر کم از کم خزانے کا نہیں ہے، لیکن کسی کو خزانے کا جھانسہ ضرور دیا گیا ہے اور یہ جھانسہ ضرور نازلی اورنگ یعنی سردار تیمور کی بیوی کو دیا گیا ہے، کیونکہ نقشہ اس کی لاش کے پاس سے ملا ہے۔ کنویں میں اس سے پہلے کسی اور شخص کو ہلاک کرکے دفن کیا گیا۔ پھر نازلی اورنگ کو ہلاک کیا گیا۔ اور پہلی لاش کے کچھ اوپر اسے دفن کیا گیا۔ پہلی لاش کے بال لمبے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وہی شخص ہے جس نے پستول خریدا اور نقشہ بنوایا، لیکن یہ خیال اس لیے زور دار نہیں، کیونکہ اسی پستول کی گولی اس کے جسم میں پائی گئی ہے جو اس نے خریدا تھا، لہٰذا میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ کسی شخص نے اورنگ شا کی کے بھیس میں پستول خریدا اور نقشہ بنوایا۔ اس کے بعد اس نے اورنگ شا کو قتل کیا اور کنویں میں دبا دیا۔ پھر چند ہفتے بعد نازلی کے ساتھ بھی یہی کیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا اور وہ کون ہے؟ سب سے پہلے جس آدمی کا نام ذہن میں آتا ہے، وہ ہے سردار تیمور۔ کیونکہ اورنگ شا اور نازلی اورنگ کا تعلق انہی سے ہے، لیکن قتل کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ دوسرے شخص ہیں ایازراؤ۔ انہوں نے حویلی کیوں خریدی اور پھر آس پاس کی زمینیں بھی خریدیں، پھر کاشت کے پروگرام کے بہانے اس کنویں کو صاف کرانے کا پروگرام بنایا۔ گویا انہیں شک تھا کہ نازلی اورنگ کہیں گم نہیں ہوئی، اس کنویں میں دفن ہے۔ اس پہلو سے سوچا جائے تو ایازراؤ قاتل نہیں ہوسکتے، لیکن یہ بھی

تو ہوسکتا ہے کہ قاتل وہی ہوں اور خود پر سے شک ہٹانے کے لیے خود ہی کنواں کھدوانا شروع کردیا ہو۔ یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ انہیں ایسا کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی، جب کہ دو سال پہلے وہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے یہ کام کرچکے تھے اور کسی نے ان پر ذرا بھی شک نہیں کیا تھا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کنویں میں دبی ہوئی لاشیں ان کے دماغ میں ہل چل مچارہی تھیں۔ اس ہل چل نے انہیں حویلی خریدنے پر مجبور کردیا اور پھر کاشت کے لیے آس پاس کے زمینیں بھی خریدیں، تاکہ کاشت کا بہانا بنا کر کنویں کی صفائی کرائی جائے اور اس دوران نکل آئیں لاشیں۔ تو لوگ ان پر ذرا بھی شک نہیں کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ انہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ نازلی اورنگ یا اورنگ شا سے انہیں کیا دشمنی تھی۔ کیا یہ حویلی وہ بھی خریدنا چاہتے تھے یا پھر نازلی سے شادی کرنا چاہتے تھے اور یہ ہوا نہیں تو انہوں نے انتقاماً ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے لیے انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا کہ پہلے ایک پستول اورنگ شا کے میک اپ میں خریدا، پھر ایک نقشہ بنوایا۔ اورنگ شا کو نقشے......''

''ایک منٹ۔ یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ ایاز راؤ کو اورنگ شا کہاں سے مل گیا۔ وہ تو ملک چھوڑ کر جاچکا تھا۔'' فرزانہ جلدی سے بولی۔

''ہاں، میں بھی اس مقام پر الجھن محسوس کررہا ہوں۔ خیر، اس کا

جواب یہ ہے کہ وہ حقیقت میں ملک چھوڑ کر نہیں گیا تھا، بلکہ اسی شہر میں یا دوسرے کسی شہر میں چلا گیا تھا اور حویلی اس نے اپنی کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے فروخت کی تھی۔ شاید اسے کسی کا قرض ادا کرنا تھا۔ قرض ادا کرکے وہ گمنامی کی زندگی گزارنے لگا، لیکن ایاز راؤ نے اسے دیکھ لیا اور انتقام لینے کا پروگرام بنایا۔ اس نے اسے وہ نقشہ دکھایا اور رات کے وقت حویلی کے اندر کنویں تک لے آیا۔ واضح رہے کہ چاردیواری کا دروازہ لوہے کی جالی کا ہے۔ اس کے اوپر سے چڑھ کر اندر آنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ دونوں کنویں کے پاس گئے اور کھدائی شروع کردی۔ انہوں نے یہ کام کافی احتیاط سے کیا ہوگا۔ رات بھر وہ مصروف رہے اور صبح ہونے سے پہلے لوٹ آئے۔ دوسرے دن پھر رات کو انہوں نے کام شروع کیا۔ مٹی وہ چاردیواری کے ساتھ ساتھ ڈالتے رہے ہوں گے اور جب گڑھا کافی گہرا ہوگیا تو ایک دن گڑھے کے اندر ایاز راؤ نے پستول نکال کر اس کی نالی اورنگ شا کے پیٹ پر رکھی اور گولی چلادی۔ ایک تو رات کا وقت تھا۔ اس کنویں کے اندر چھوٹے سے پستول کے چلنے کی آواز نے کسی کو نہ جگایا۔ اورنگ شا گولی کھا کر گرا اور ایاز راؤ نے اس پر مٹی ڈالنا شروع کی۔ صبح ہونے تک وہ مٹی ڈالتا رہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ کچھ ہفتے بعد کسی تقریب میں اس نے نازلی اورنگ سے ملاقات کی اور نقشہ اسے دکھایا۔ وہ بھی خزانے کی تلاش میں اس کا ساتھ دینے پر تیار ہوگئی اور باپ کی طرح موت کی گود

میں جاسوئی۔ ایاز راؤ نے اس پر بھی مٹی ڈال دی اور اپنے گھر چلا گیا۔ شاید وہ جاتے وقت اپنے قدموں کے نشان بھی مٹا گیا ہوگا۔ دوسرے دن سردار تیمور کو اپنی بیگم غائب ملی۔ اس نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ اخبارات میں اشتہارات دیے، لیکن نازلی کہیں ہوتی تو ملتی بھی۔ حیرت صرف اس پر ہے کہ پولیس نے کنواں کیوں نہ کھدوایا۔ اس کنویں پر انہیں کیوں شک نہیں گزرا۔ خیر، ہوسکتا ہے، پولیس انسپکٹر کو قاتل نے خفیہ طور پر یہ پیش کش کی ہو کہ اگر وہ کنواں نہ کھدائے گا تو اسے اتنے ہزار یا ایک دو لاکھ روپے دے دیے جائیں گے اور تھانے دار صاحب نے سوچا ہوگا کہ اس کا کیا جاتا ہے، اگر وہ کنواں نہ کھدوائے، چنانچہ اس نے فون پر کہہ دیا ہوگا کہ اچھا کنواں نہیں کھدے گا۔ یہ صرف امکان ہے۔ ہوسکتا ہے، پولیس انسپکٹر نے کنواں کھدوانے کی واقعی ضرورت محسوس نہ کی ہو۔ اس طرح ایاز راؤ کے پاس دونوں کو قتل کرنے کی وجہ موجود ہے۔ جب کہ سردار تیمور کے پاس بظاہر کوئی وجہ نہیں۔'' یہاں تک کہہ کر محمود خاموش ہوگیا۔

''گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ قاتل ایاز راؤ صاحب ہیں۔'' فرزانہ نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''ہاں، میرا خیال تو یہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''فاروق، تم کیا کہتے ہو؟'' فرزانہ اس کی طرف مڑی۔

''فی الحال میں اپنا خیال محفوظ رکھتا ہوں، تم بیان کرو۔''

''لیکن تم مجھ سے بڑے ہو۔ پہلے تمہارا حق ہے۔'' فرزانہ نے منہ بنایا۔

''بس اب اس پر لڑنا شروع کردو۔ چلو فاروق پہلے تم بیان کرو۔'' محمود نے جھلا کر کہا۔

''اچھی بات ہے۔ میں لمبی چوڑی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ تم نے بہت اچھا جائزہ پیش کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا بھی یوں ہی ہے، لیکن سب سے اہم بات۔ یہ پوری تفصیل سننے کے بعد جو ذہن میں ابھرتی ہے، وہ یہ ہے کہ نازلی اورنگ سردار تیمور کی بیوی تھی، فوزیہ کی ماں تھی۔ تھانے دار صاحب نے تو رشوت لے لی، یا ان کی عقل پر تو پردہ پڑ گیا تھا، لیکن سردار تیمور کو آخر کنویں کا خیال کیوں نہیں آیا۔ انہوں نے پولیس کو کیوں مجبور نہیں کیا کہ جناب اس کنویں کی طرف بھی توجہ دیں۔ کہیں میری پیاری بیوی اس کنویں میں تو دفن نہیں۔ آخر کیوں۔ اس کیوں کا جواب یہی ذہن میں آتا ہے کہ چونکہ، وہ خود قاتل ہیں، اس لیے انہوں نے پولیس کی توجہ کنویں کی طرف نہیں دلائی۔'' فاروق یہاں تک کہہ کر خاموش ہوگیا۔

''ویری گڈ فاروق، تم نے بہت اچھا اعتراض کیا۔ لیکن بھئی اس کا جواب یہ ہے کہ سردار تیمور تو شروع سے یہ خیال کرتے رہے کہ ان کی بیوی کا دل چونکہ یہاں سے اچاٹ ہوگیا تھا، لہٰذا وہ اپنے ملک چلی گئی۔ ان خیالات کی روشنی میں ان کا دھیان کنویں کی طرف کس طرح جاسکتا

تھا۔''

''تم نے بھی اعتراض کا جواب بہت اچھا دیا۔ لیکن میں پھر بھی قاتل سردار تیمور کو ہی سمجھوں گا، کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان کی بیوی ہر روز کنواں کھودنے کے سلسلے میں سونے کے کمرے سے غائب ہو اور سردار تیمور کو ایک دن بھی پتا نہ چلے اور پھر نازلی کو نقشے کے بارے میں اپنے شوہر سے کوئی بات چھپانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا وہ ان سے الگ رہتے ہوئے خزانہ حاصل کرنے کے چکر میں تھی، جب کہ اس گھر میں اس کا صرف شوہر ہی نہیں۔ نوجوان بیٹی بھی موجود تھی۔ وہ ان سے چوری چھپے خزانہ حاصل کر کے کیا کرتی۔'' فاروق نے کہا۔

''چلو خیر، تمہارے خیال میں قاتل سردار تیمور ہے اور میرے خیال میں ایاز راؤ۔ فرزانہ تم کیا کہتی ہو۔''

''میرے لیے تم نے چھوڑا ہی کیا ہے۔'' فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

''لو اور سنو میں نے کہا نہیں تھا کہ پہلے تم اپنا خیال ظاہر کرو۔'' فاروق کاٹ کھانے والے انداز میں بولا۔

''بھئی، اگر تم یہی خیال پیش کرنا چاہتی تھیں جو فاروق نے پیش کیا ہے تو تم کہہ سکتی ہو کہ فاروق کی ہم خیال ہوں۔''

''یہی تو مصیبت ہے۔ میری ہم خیال تو کسی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''جہاں تک میں سمجھتی ہوں، قاتل نہ تو سردار تیمور ہیں اور نہ ایاز راؤ صاحب، قاتل کوئی تیسرا شخص ہے جسے ان باپ بیٹی سے کوئی دشمنی تھی۔ ہوسکتا ہے، وہ ان کے ملک کا کوئی شخص ہو، وہ نازلی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہو اور سردار تیمور سے اس کی شادی کو برداشت نہ کرسکا ہو اور اس نے بالکل اسی طریقے سے، جو تم نے بتایا، ان دونوں کو قتل کر دیا ہو۔'' فرزانہ نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

''لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اسے انتقال کا خیال کیوں آیا۔'' فاروق نے اعتراض کیا۔

''یہ بات تو ایاز راؤ کے سلسلے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد انہیں انتقام لینے کا خیال کیوں آیا؟'' فرزانہ بولی۔

''موقع ملنے کی بات ہے۔ اپنے بچاؤ کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ بعض لوگ انتقام کی آگ میں مدتوں جلتے رہتے ہیں اور مناسب موقع کے انتظار میں رہتے ہیں۔'' محمود نے اعتراض کا جواب دیا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے، حالانکہ وہ نہیں جانتے، انتقام لینے کی نسبت معاف کر دینا بہتر ہے۔ اسلام بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے۔'' فرزانہ بولی۔

''بالکل، تو پھر اس کا مطلب ہے، ہم تینوں الگ الگ نتیجے پر پہنچے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایاز راؤ قاتل ہے۔ فاروق کا خیال ہے کہ

سردار تیمور قاتل ہے اور فرزانہ کا کہنا یہ ہے کہ قاتل اورنگ شا کا کوئی ہم وطن ہے۔'' محمود نے جلدی جلدی کہا۔

''اس طرح تو اباجان فائدے میں رہیں گے۔'' فاروق بول پڑا۔

''کیا مطلب؟'' فرزانہ چونک کر بولی۔

''انہیں ہم میں سے صرف ایک کو انعام دینا پڑے گا یا پھر ایک کو بھی نہیں، کیونکہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ قاتل کوئی اور ہی ہو۔'' فاروق نے کہا اور وہ مسکرا دیے۔

''مسئلہ صرف یہی نہیں کہ قاتل کون ہے یا کون ہوسکتا ہے۔ ہمیں تو قاتل کے خلاف ثبوت بھی حاصل کرنا پڑے گا۔ ثبوت، آخر ہم ثبوت کس طرح حاصل کریں گے؟'' محمود نے پریشان ہوکر کہا۔

''اور میرا خیال ہے، اباجان اس وقت ثبوت کے لیے ہی کہیں گئے ہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''اوہ ہاں، ضرور یہی بات ہے۔'' محمود چونکا۔

''لیکن ہمیں تو اپنے طور پر ثبوت حاصل کرنا ہوگا۔'' فرزانہ نے کہا۔

''ہاں۔'' محمود نے کہا اور کسی گہری سوچ میں گم ہوگیا۔ اچانک اس کے منہ سے نکلا:

''اوہ۔''

''یہ اوہ کس خوشی میں؟'' فاروق بولا۔

محمود نے کوئی جواب نہ دیا۔ اچانک اٹھا اور بیرونی دروازے کی طرف لپکا۔

''ارے ارے، کہاں جا رہے ہو؟''

''ثبوت حاصل کرنے، خبردار میرے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ تم اباجان سے ایک ایک ہزار روپیہ حاصل نہیں کرسکو گے۔'' ہاں، میرے جانے کے پانچ منٹ بعد تم کہیں بھی جاسکتے ہو۔''

''جاؤ جاؤ، ہم بھی عقل سے پیدل نہیں ہیں۔'' فرزانہ نے تملا کر کہا اور محمود دروازے سے نکل گیا۔ فوراً ہی انہوں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔

☆☆☆

قاتل صاحب

''کیا خیال ہے فرزانہ، محمود کہاں گیا ہے؟'' فاروق نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

''پتا نہیں، پہلے اباجان گئے اور پھر محمود۔ اور میری تو شاید اس مرتبہ عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔'' فرزانہ نے منہ بنایا۔

''چلو اچھا ہے، بے چاری بہت دنوں سے بھوکی تھی۔'' فاروق خوش ہوکر بولا۔

''تو کیا اس مرتبہ انعام صرف محمود حاصل کرسکے گا۔'' فرزانہ نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

''کیا کہہ سکتا ہوں، تمہاری عقل گھاس چرنے جاچکی ہے۔ میرے پاس عقل ویسے ہی کم ہے۔'' فاروق نے کندھے اچکائے۔

''اگر ہم یہ سوچنے میں کامیاب ہوجائیں کہ محمود کہاں گیا ہے تو شاید ہم بھی انعام حاصل کرسکیں گے۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''یہ کیس تو ہمارے لیے ایک امتحان بن گیا ہے۔''

''اور اس میں پاس ہونا بہت مشکل نظر آرہا ہے۔ کیوں یہی بات ہے نا۔''

''لیکن فیل ہونا تو ہم نے بھی نہیں سیکھا۔'' فاروق نے پرعزم لہجے میں کہا: ''آؤ ہم ایک بار پھر ذہن دوڑائیں۔''

دونوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اچانک فاروق نے فرزانہ کو چونکتے دیکھا، پھر اس کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا:

''اف خدا، اس طرف تو میرا دھیان گیا ہی نہیں۔''

''کس طرف؟'' فاروق نے بے تاب ہوکر کہا۔

''سوری فاروق، میں تمہیں نہیں بتاسکتی کہ میرا دھیان کس طرف نہیں گیا۔ کیونکہ یہ معاملہ ایک ہزار روپے کا انعام حاصل کرنے کا ہے۔ اچھا، میں چلی۔ ٹاٹا۔'' اس نے شوخ انداز میں کہا اور تیر کی طرح باہر نکل گئی۔

''ارے ارے، سنو تو سہی، مجھے یوں بے یارو مددگار تو نہ چھوڑو۔'' فاروق نے بوکھلا کر کہا، لیکن فرزانہ تو اتنی دیر میں گھر سے نکل بھی چکی تھی۔ فاروق میز پر تنہا بیٹھا رہ گیا۔ چند منٹ بعد بیگم جمشید باورچی خانے سے نکلیں تو انہوں نے چونک کر کہا:

''ہائیں فاروق، تم اکیلے بیٹھے ہو۔ محمود اور فرزانہ کہاں گئے۔''

''جی ایک ایک ہزار روپے انعام حاصل کرنے۔''

''اوہ، تو تم کیوں نہیں گئے۔''

''جاؤں تو تب نا، جب مجھے یہ معلوم ہو کہ جانا کہاں ہے۔'' اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

''کیا میں تمہاری کوئی مدد کرسکتی ہوں۔''

''جی نہیں آپ بھی میری کوئی مدد نہیں کرسکتیں۔ جو شخص خود اپنی مدد نہ کرسکے، کوئی کیا اس کی مدد کرے گا۔ مجھے اپنی مدد خود ہی کرنا ہوگی، اپنی عقل کو آواز دینا ہوگی۔''

''تو پھر دو نا آواز، وقت نکلا جارہا ہے۔'' بیگم جمشید نے پریشان ہوکر کہا۔

''جی اچھا۔'' فاروق نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا اور پھر منہ آسمان کی طرف کرکے بولا:

''آ اے پیاری عقل، تو کہاں جاسوئی ہے۔''

اس کے انداز پر بیگم جمشید کو ہنسی آگئی اور وہ پھر باورچی خانے کی طرف مڑگئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ صحن کی طرف آئیں، تو فاروق بھی غائب تھا۔

''شاید فاروق کی عقل نے اس کی آواز سن لی۔'' وہ بڑبڑائیں۔ اسی وقت قدموں کی آواز گونجی۔ انہوں نے سر اوپر اٹھایا تو انسپکٹر جمشید حیران سے چلے آرہے تھے۔

''خیر تو ہے بیگم، دروازہ آج اندر سے بند نہیں ہے۔''

''ان تینوں کو پتا نہیں کام ہوگیا۔ باری باری نکل گئے اور وہ بھی

بغیر بتائے۔ اسی لیے میں دروازہ اندر سے بند نہ کرسکی۔''

''اور اگر ایسے میں کوئی دشمن اندر گھس آتا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''تو کام ہوا۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوچکا ہے۔ میں اس سے نبٹ لیتی۔'' بیگم جمشید مسکرائیں۔

''تو تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ تینوں کہاں گئے ہیں۔''

''فاروق بتا رہا تھا کہ محمود اور فرزانہ ایک ایک ہزار روپے انعام حاصل کرنے کے چکر میں گئے ہیں، پھر وہ خود بھی چلا گیا۔''

''ہوں، پھر تو شاید مجھے جیب سے تین ہزار روپے دینا پڑیں گے۔'' وہ بولے۔

''معاملہ کیا ہے؟''

''معاملہ، حیرت انگیز بات یہی ہے کہ معاملہ اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔''

''یعنی آپ کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''نہیں۔'' انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔

''پھر وہ تینوں کس طرح انعام حاصل کریں گے۔''

''جس حد تک معاملہ میری سمجھ میں آ گیا ہے، اگر اس حد تک انہوں نے بھی سمجھ لیا، تب تو انہیں انعام دینا ہی پڑے گا۔''

''خیر، لیکن یہ عجیب ترین بات ہے کہ معاملہ آپ کی سمجھ میں

پوری طرح نہیں آیا۔"

"ہاں، اس کیس میں میں بے چارگی سی محسوس کر رہا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ انداز محمود کا تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ محمود کچھ زیادہ خوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"شاید تم مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکے۔" وہ مسکرائے۔

"جی نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد فرزانہ کی واپسی ہوئی۔ اس کا حال بھی محمود سے مختلف نہیں تھا۔

"تو تم بھی کامیاب نہیں ہو سکیں۔"

"جی مکمل طور پر نہیں۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا: "ارے، فاروق کہاں ہے؟"

"تمہارے جانے کے بعد وہ بھی گھر سے نکل گیا تھا۔" بیگم جمشید نے منہ بنایا۔

آدھ گھنٹے بعد دروازے کی گھنٹی پھر بجی۔ اس مرتبہ فاروق آیا تھا۔ اس کی صورت پر بھی اڑھائی بج رہے تھے۔

"تو تم بھی تقریباً ناکام لوٹے ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی ہاں اباجان۔"

"بھئی، اس میں مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ اس مرتبہ تو مجھے بھی پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی کیا مطلب؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

☆☆☆

حویلی کے ڈرائنگ روم میں اس وقت ایاز راؤ گھونگی عرفان راؤ گھونگی، سردار تیمور، فوزیہ تیمور، ان دونوں گھروں کے ملازم، نقشہ نویس امتیاز نیازی، اسلحے کا وہ ڈیلر جس سے پستول خریدا گیا تھا، انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق، فرزانہ، اکرام اور پولیس کے چند اور آفیسر موجود تھے۔ ان میں ایک معمر آدمی بھی تھے۔ ان سب لوگوں کو یہاں انسپکٹر جمشید نے جمع کیا تھا۔ وہ سب حیران تھے کہ انہیں یہاں کیوں جمع کیا گیا تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی جیبوں میں اس وقت ایک ایک کاغذ موجود تھا۔ اس کاغذ پر انہوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق قاتل کا نام اور قتل کا ثبوت وغیرہ درج کر رکھا تھا، کیونکہ انہیں بھی ایک ایک ہزار روپے انعام میں حاصل کرنا تھے۔ سب لوگ انسپکٹر جمشید کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے دل بھی دھک دھک کر رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو۔ آخر ایک کانسٹیبل کے ساتھ ایک عمر رسیدہ آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک تھی۔

"آیئے فاروقی صاحب، مجھے آپ کا ہی انتظار تھا۔ آپ کا فون ملنے کے بعد ہی میں نے ان سب لوگوں کو یہاں جمع کیا ہے۔ اور آپ کو بھی زحمت دی ہے۔ امید ہے، معاف فرمائیں گے۔" انسپکٹر جمشید خوش

اخلاق لہجے میں بولے۔ انہوں نے اٹھ کر فاروقی صاحب سے ہاتھ بھی ملایا۔

''معافی کی اس میں کیا بات ہے جناب۔ قانون کی مدد کرنا تو ہر شہری کا فرض ہے۔'' فاروقی صاحب بولے۔ اب انسپکٹر جمشید نے سب پر ایک نظر ڈالی۔ فاروقی صاحب ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

''محمود، فاروق، فرزانہ اپنے اپنے کاغذ مجھے دے دو۔''

''جی بہتر۔'' انہوں نے ایک ساتھ کہا اور پھر تینوں نے اپنا اپنا کاغذ نکال کر دے دیا۔ انہوں نے کاغذ پڑھے بغیر جیب میں رکھ لیے۔

''آپ لوگ حیران تو ہوں گے کہ میں نے آپ سب کو یہاں جمع کیاں کیا ہے، لیکن کسی حد تک اندازہ بھی لگا چکے ہونگے۔ تو سنیے، یہ معاملہ ہے، دو آدمیوں کے قتل کا۔ جنہیں آج سے تقریباً دو سال پہلے قتل کر دیا گیا تھا اور جن کی لاشیں اب برآمد ہوئیں۔ اگر لاشیں برآمد نہ ہوتیں تو نہ جانے یہ معاملہ کب تک دبا رہتا۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ اعتراف بھی کروں گا کہ یہ میری زندگی کا ایک ایسا کیس ہے، جسے میں مکمل طور پر حل نہیں کر سکا۔ میں نے یہ تو معلوم کر لیا ہے کہ قاتل کون ہے اور اس نے یہ قتل کس طرح کیے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کر سکا کہ قتل کیے کیوں گئے۔ اس سلسلے میں میں نے اندازہ ضرور لگایا ہے، لیکن اس اندازے کے درست ہونے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں، لہذا میں یہی کہوں گا کہ میں اس کیس کو پوری طرح حل کرنے میں کامیاب

نہیں ہو سکا۔ جس قدر میں جانتا ہوں، آپ لوگوں کے سامنے عرض کیے دیتا ہوں۔ قتل کی وجہ قاتل صاحب خود بتائیں گے، کیونکہ اس موقعے پر انہیں وجہ بتانا ہی ہوگی۔ وہ نہ بھی بتائیں گے، تب بھی جرم تو میں ان پر ثابت کر ہی دوں گا۔ اتفاق سے آج میں نے یہاں پولیس کے چند اعلیٰ افسروں کے ساتھ اپنے ایک مہربان جج صاحب کو بھی زحمت دی ہے۔''

انہوں نے اس معمر آدمی کی طرف اشارا کیا اور گفتگو جاری رکھی۔

''یہ رینارڈ جج ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی صرف اور صرف انصاف سے کام لیا ہے۔ آپ سوچیں گے کہ میں نے انہیں کیوں تکلیف دی، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اپنے اس اندازے کے درست ثابت ہونے کی صورت میں۔ یعنی قتل کی جو وجہ میں نے سوچی ہے، اس کے درست ہونے کی صورت میں جج صاحب کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ اب سنیے، کہانی دراصل کیا ہے۔ آج سے تقریباً تیس سال پہلے یہ حویلی ایک غیر ملکی شخص اورنگ شا کی ملکیت تھی۔ اس نے بھی یہ حویلی کسی سے خریدی تھی۔ اورنگ شا کی ایک بیٹی بھی تھی۔ اس کا نام نازلی اورنگ تھا۔ اورنگ شا نے اچانک حویلی فروخت کرنے کا پروگرام بنالیا۔ خریدار جو آئے، ان میں بڑھ کر قیمت سردار تیمور صاحب نے لگائی، لہذا حویلی ان کے ہاتھ فروخت کر دی گئی۔ حویلی فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ اورنگ شا نے اپنی بیٹی کی شادی بھی سردار تیمور صاحب سے کر دی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس شادی کے لیے اس نے خود سردار تیمور صاحب

سے کہا تھا یا سردار تیمور صاحب نے اس سے درخواست کی تھی۔ اگر سردار تیمور صاحب پسند کریں تو اس موقعے پر یہ بتادیں کہ شادی کس طرح ہوگئی۔'' یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہوگئے۔

''جی ہاں، کیوں نہیں۔'' سردار تیمور انتہائی پرسکون انداز میں مسکرائے: ''اورنگ شا اپنی بیٹی کی ملک میں کسی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ اس نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے اس وقت تک شادی نہیں کی تھی، لہٰذا میں نے خود کو پیش کردیا اور اورنگ شانے فوراً ہی ہماری شادی کرادی۔''

''بہت بہت شکریہ۔ اس طرح ہمیں حالات سمجھنے میں اور آسانی ہوگئی۔'' انسپکٹر جمشید خوش ہوکر بولے۔

''شادی کے بعد اورنگ شا اپنے پروگرام کے مطابق اپنے ملک چلا گیا۔ میں نے ریکارڈ چیک کرایا ہے۔ ان تاریخوں میں ایک جہاز سے اورنگ شا کا سفر کرنا ثابت ہے، لہٰذا ہم یہی کہیں گے کہ وہ چلا گیا اور سردار تیمور اپنی بیوی کے ساتھ اس حویلی میں رہنے لگے۔ حویلی بہت بڑی تھی۔ اس لیے انہوں نے تنہائی کا احساس مٹانے کے لیے تین ملازم بھی رکھ لیے۔ اس سے پہلے سردار تیمور جہاں رہتے تھے، وہاں ان کے پاس صرف ایک ملازم تھا۔ ان تینوں ملازموں کو حویلی کے اندر ہی کمرے دے دیے گئے۔ پھر سردار تیمور کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی اور آج سے دو سال پہلے اچانک ان کی بیوی گم ہوگئی۔ انہوں نے پولیس

میں رپورٹ درج کرائی۔ اخبارات میں اشتہارات دیے، لیکن کچھ پتا نہ چلا۔ پولیس نے بھی تلاش کیا، لیکن اس نے حویلی کا کنواں کھودنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بیگم کی گمشدگی نے سردار تیمور کا دل اس حویلی سے اچاٹ کردیا اور انہوں نے شہر میں جگہ خرید کر نئی کوٹھی کی تعمیر شروع کردی۔ ان کا ارادہ تھا کہ حویلی سے ہٹ کر اس کوٹھی میں رہنے لگیں۔ ان کے ارادے کی خبر ان کے بچپن کے دوست ایاز راؤ گھوگی کو گی۔ جب سے سردار تیمور کی بیوی غائب ہوئی تھی، یہ بھی الجھن میں تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں یہ شک گزرا تھا کہ کہیں سردار تیمور کی بیوی کو ہلاک تو نہیں کردیا گیا۔ اپنے اس شبے کو دور کرنے کے لیے انہوں نے حویلی خریدنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن اس وقت انہوں نے سردار تیمور کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کنویں کو بھی صاف کرائیں گے، چنانچہ سردار تیمور نے حویلی فروخت کردی، ایاز راؤ نے اس میں منتقل ہونے کے پہلے روز ہی اپنے دوستوں کو دعوت دی۔ اس دعوت میں میرے بچوں کو بھی بلایا گیا۔ دعوت سے ایک روز پہلے شام کے وقت انہوں نے کنویں کی صفائی کے لیے مزدور لگادیے تھے۔ سورج غروب ہونے پر انہیں ہٹادیا گیا۔ دوسرے دن انہوں نے پھر کام شروع کردیا، لیکن شاید دوسرے دن بھی انہیں بعد دوپہر کام پر لگایا گیا تھا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ لاش پارٹی کے دوران برآمد ہوئی۔ اور شاید یہی ایاز راؤ چاہتے تھے۔ اس طرح ان پر تو کوئی شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس دوران حویلی میں تہہ خانے کی

موجودگی کا علم ہوا۔ ان تینوں نے اسے بھی دیکھا۔ وہاں بے تحاشا بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں تین سوراخ بھی نظر آئے، جن کے بارے میں خیال کیا گیا کہ چوہوں نے بنائے ہوں گے اور اندر چوہے مرگئے ہیں، جن کی بُو تہہ خانے میں پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے ان سب حالات کا پتا چلا، تو میں نے تہہ خانے کا معائنہ سب سے پہلے کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بُو چوہوں کی نہیں، انسانی جسم کی ہے، چنانچہ ان سوراخوں کے پاس کھدائی شروع کرائی اور ایک اور لاش ملی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لاش بھی دراصل کنویں میں ہی دبائی گئی تھی اور پہلی لاش سے نیچے تھی۔ اس لاش تک چوہوں نے بل بنالیے تھے اور ان سوراخوں سے بُو تہہ خانے تک جاری تھی، لیکن مجھے ایک بات پریشان کررہی تھی کہ ان سوراخوں سے اس قدر بدبُو تہہ خانے میں نہیں پھیل سکتی تھی۔ تفتیش شروع کی گئی۔ دوسری لاش کا حلیہ نازلی اورنگ کے باپ اورنگ شا سے ملتا جلتا تھا۔ نقشہ نویس امتیاز نیازی صاحب اور اسلحے کے ڈیلر صاحب نے یہی حلیہ بتایا تھا، لہٰذا ہم نے خیال کیا کہ دوسری لاش اورنگ شا کی ہی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر پستول خود اورنگ شا نے خریدا تھا، تو پھر اس کے پستول سے اس کو کس نے ہلاک کیا۔ یہاں میں یہ بھی بتادوں کہ کنویں کی مٹی میں سے جو پستول ملا ہے، دونوں لاشوں میں سے ملنے والی گولیاں اسی پستول سے چلائی گئی ہیں اور یہی پستول اس شخص نے خریدا تھا، جس کا حلیہ اورنگ شا جیسا تھا۔ سردار تیمور صاحب نے بھی

اورنگ شا کا حلیہ ایسا ہی بتایا۔ ہاں تو ہم اس سوچ میں ڈوب گئے کہ اگر پستول اورنگ شا نے خریدا تھا، تو پھر اس کے پستول سے اسی کو کس نے ہلاک کردیا۔ آخر سوچ سوچ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ پستول اورنگ شا نے نہیں، اس کے حلیے میں کسی اور نے خریدا تھا اور نقشہ بھی اسی نے بنوایا تھا۔ کیونکہ اس پستول سے اورنگ شا اور نازلی اورنگ کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔ پہلے اس نے اورنگ شا کو ٹھکانے لگایا، لیکن اسے ٹھکانے لگا کر وہ فوری طور پر اسے دفن نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ کنویں کی مٹی کھودنا اتنا آسان اور جلدی ختم ہونے والا کام نہیں تھا، لہٰذا اس نے اس کی لاش کو تہہ خانے میں ڈال دیا۔ اور خود دوسرے دن اورنگ شا کے حلیے میں امتیاز نیازی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ ان سے نقشہ بنوایا اور پھر اپنے ملازموں کو وہ نقشہ دکھا کر رات کے وقت کنواں کھودنے پر مجبور کردیا۔ مجرم نے انہیں لالچ دیا ہوگا کہ اگر خزانہ مل گیا تو اس میں سے انہیں بھی برابر کا حصہ ملے گا۔ اس نے نقشہ ملنے کی بھی کوئی کہانی گھڑ کر انہیں سنادی ہوگی، چنانچہ ملازم رات گئے تک کنویں پر لگے رہے۔ کنواں جب کافی گہرا کھد گیا تو اس نے انہیں یہ کہہ کر مایوس کردیا کہ شاید یہ نقشہ کسی کا مذاق ہے۔ ملازم چلے گئے اور مجرم نے تہہ خانے سے لاش نکال کر کنویں میں ڈال دی۔ تہہ خانے والا کمرہ کنویں کے بالکل سامنے ہے۔ اسے صرف اتنا کرنا پڑا ہوگا کہ لاش تہہ خانے سے نکال کر، کھڑکی کھول کر کنویں میں پھینک دی ہوگی۔ کیونکہ کنواں مین اس کھڑکی کے

پہنچے ہے۔''

انسپکٹر جمشید سانس لینے کے لیے رکے۔ انہوں نے دیکھا، اب سب کی نظریں سردار تیمور کی طرف اٹھ گئی تھیں، کیونکہ لاش کو تہہ خانے میں ڈالنے اور پھر ملازموں کے ذریعے کنواں کھدوانے اور کنواں کھدوانے کے بعد لاش اس میں ڈالنے کے بیان سے صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ یہ سب کچھ سردار تیمور کا کیا دھرا ہے، لیکن دوسری طرف سردار تیمور کے چہرے پر ذرا بھی فکرمندی کے آثار نہیں تھے۔ وہ برابر مسکرائے جا رہے تھے، جیسے انسپکٹر جمشید جو کچھ کہہ رہے ہیں، بالکل غلط ہو۔ ان کی مسکراہٹ محمود، فاروق اور فرزانہ کو پریشان کرگئی۔ فرزانہ نے جلدی سے کہا:

''تو کیا ان دنوں حویلی میں سردار تیمور کے ہاں کوئی مہمان بھی ٹھہرا ہوا تھا یا ایک آدھ دن کے لیے آیا ہوا تھا۔'' اس کا اشارا ایاز راؤ کی طرف تھا۔

''نہیں، حویلی میں ان دونوں سردار تیمور، نازلی اورنگ، فوزیہ اور تین ملازموں کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں تھا۔ ایاز راؤ صاحب کا تو اس معاملے سے بس اتنا ہی تعلق ہے کہ نازلی اورنگ کے گم ہونے پر انہیں سردار تیمور پر شک تھا، لہٰذا انہوں نے حویلی خریدنے اور کاشت کے بہانے کنواں کھدوانے کا منصوبہ بنایا اور اس طرح لاشیں برآمد کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس واقعے کے ذمے دار صرف اور صرف سردار

تیمور ہیں۔ اورنگ شاہ کے بعد انہوں نے چند ہفتے انتظار کیا اور پھر یہی سلوک اپنی بیوی کے ساتھ کیا۔''

''نہیں۔'' فوزیہ کی چیخ نے کمرے کی فضا کو تھرا دیا، وہ اپنے حلق کی پوری قوت سے چلائی تھی۔

''ارے ارے، بیٹی۔ گھبراؤ نہیں۔ سنتی جاؤ، اور مزے لے کر سنو۔'' سردار تیمور نے ہنس کر کہا۔

ان کے اطمینان پر انہیں اس قدر حیرت ہوئی کہ کیا کبھی ہوئی ہوگی، خود فوزیہ نے بھی بوکھلا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ بیٹی کا مطلب سمجھ کر وہ اور بھی زور سے مسکرائے اور بولے:

''گھبراؤ نہیں، میں پاگل نہیں ہوگیا۔''

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور پھر پولیس میں رپورٹ درج کرادی۔ اخبارات میں اشتہارات بھی شائع کرائے۔ پولیس افسر نے اس کنویں کی طرف شاید اس لیے توجہ نہیں دی کہ سردار تیمور کی شہر میں بہت عزت ہے۔ یہ بہت اچھے آدمی گنے جاتے ہیں، ملک اور قوم کی خدمت کرنے والے۔ ملک اور قوم کے سچے ہمدرد، ایمان دار مخلص اور ان کی شہرت نجی آفیسروں تک پہنچی ہوئی ہے۔ ان کی اس شہرت اور نیک نامی سے متاثر ہوکر پولیس افسر نے کنویں کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ اپنی بیگم کی گمشدگی کے ذمے دار خود سردار تیمور ہیں

اور اسی طرح اڑھائی سال گزر گئے۔ اس عرصے میں سردار تیمور اور ان کی بیٹی حویلی میں وحشت سی محسوس کرنے لگے۔ انہوں نے زمین خرید کر ایک کوٹھی بنوائی اور وہاں منتقل ہونے کا پروگرام بنایا اور اس طرح ایاز راؤ کو اپنے دوست کے خلاف چھان بین کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ ہے کل کہانی لیکن سب سے اہم بات جو میں نہیں بتا سکتا۔ وہ یہ ہے کہ ابھی تک میں یہ معلوم نہیں کرسکا کہ سردار تیمور کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب ہم سردار تیمور کی طرف مڑتے ہیں۔ پہلے تو ہم ان سے یہ پوچھیں گے کہ کیا انہیں اس جرم کا اقرار ہے۔ اگر یہ کہیں گے کہ نہیں تو ہم ان کے خلاف ثبوت بھی پیش کرسکتے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید کے لہجے میں شوخی آ گئی۔ وہ خاموش ہوکر سردار تیمور کی طرف دیکھنے لگے۔

''پہلے تو آپ ثبوت پیش کریں۔ اس کے بعد میں کچھ عرض کروں گا۔'' اس مرتبہ سردار تیمور کے لہجے میں حیرت کی جھلک دکھائی دی تھی، البتہ ان کے اطمینان اور سکون میں اب بھی ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔

''اسلحے کے وہ ڈیلر جن سے آپ نے پستول خریدا تھا۔ یہاں موجود ہیں۔ انہوں نے آپ کا پورا حلیہ اپنے رجسٹر میں درج کیا تھا۔ اس حلیے میں صرف یہی تین باتیں، یعنی لمبے بال، درمیانہ پتلا دبلا اور بھرے بھرے گالوں کا ہی اندراج نہیں ہے۔ آنکھوں کا رنگ، ناک کی بناوٹ، ٹھوڑی کا گڑھا وغیرہ بھی کچھ ہے اور پھر آپ نے ان کے رجسٹر میں اورنگ شاکے نام کے دستخط بھی تو کیے تھے، ہم نے ان دستخطوں کی

نقل حاصل کرلی ہے اور ان کے کھالوں والے دفتر سے ان کی تحریر کا نمونہ بھی حاصل کرلیا ہے۔ تحریر کے ماہر بھی یہاں موجود ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ دستخط اور تحریر ایک ہی آدمی کے ہاتھ کے ہیں۔ یہ ہے وہ ٹھوس ثبوت جو آپ کو قاتل ثابت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی حویلی میں کنویں سے لاشیں ملنا، تہہ خانے میں بدبو ہونا بھی کچھ کم ثبوت نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ آپ کے تینوں ملازم نقشے والی بات کی گواہی دیں گے۔ اب آپ کیا کہتے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید خاموش ہوگئے۔

''کچھ بھی نہیں، میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ دونوں قتل میں نے کیے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''ڈیڈی۔'' ایک بار پھر فوزیہ چیخ اٹھی۔

''حوصلہ بیٹی حوصلہ۔ ایسے نہیں چیخا کرتے۔ تم ایک سچے، ایماندار اور مخلص باپ کی بیٹی ہو۔'' انہوں نے فوزیہ کے شانے پر تھپکی دی۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا ڈیڈی۔ میری ممی نے آخر کیا گناہ کیا تھا؟''

''ان دونوں نے گناہ بہت بڑا کیا تھا بیٹی، بہت بڑا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تمہاری ماں مجھے بھی کم عزیز نہیں تھی اور میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اس کے ساتھ گزارا تھا، لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ دراصل وہ کیا تھی۔ اس کا باپ کیا تھا۔'' انہوں نے کہا، پھر انسپکٹر جمشید کی طرف مڑا:

''ہاں انسپکٹر صاحب، کیا آپ وجہ بھی بتائیں گے کہ میں نے یہ جرم کیوں کیا؟''

''نہیں، میں وجہ کے بارے میں صرف اندازے لگا سکتا ہوں۔ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لیے وجہ آپ کے منہ سے سننا پسند کروں گا۔ ہاں، محمود، فاروق اور فرزانہ کی طرح وجہ میں نے لکھ کر جیب میں رکھی ہوئی ہے۔'' انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''آپ نے قتل کی وجہ کے بارے میں جو اندازہ لگایا ہے، وہ کس طرح لگا سکے ہیں۔''

''میں ان لوگوں سے ملا ہوں، جن کی دعوتوں میں نازلی اورنگ شامل ہوا کرتی تھی، اسی سے میں نے اندازہ لگایا ہے۔''

''تب شاید آپ نے ٹھیک ہی اندازہ لگایا ہے۔ اسی لیے آپ نے جج صاحب کو بھی آنے کی زحمت دی ہے۔''

''ہاں، مہربانی فرما کر اب وجہ بیان کردیں، تاکہ دوسروں کی بے چینی میں اور اضافہ نہ ہو۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی ہاں، کیوں نہیں۔ اورنگ شا حویلی بیچ کر چلا گیا تھا۔ میں نے خود اسے جہاز پر سوار کرایا تھا۔ جہاز کو اپنی آنکھوں سے اڑتے دیکھا، لیکن اڑھائی سال پہلے ایک دن میں نے اپنی بیوی کو کمرے سے نکل کر دبے پاؤں باہر جاتے دیکھ لیا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ وہ کہاں جارہی ہے۔ میں نے احتیاط سے اس کا پیچھا کیا تو وہ حویلی کے پچھلے

حصے میں کنویں کے پاس کسی سے باتیں کررہی تھی۔ نزدیک ہوکر جب میں نے ان دونوں کی باتیں سُنیں تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، دوسری آواز نازلی کے باپ اورنگ شا کی تھی، وہ اسے بتا رہا تھا:

''نازلی، مجھے واپس ایک بار پھر اسی ملک میں بھیج دیا گیا ہے۔ لیکن ہدایات یہ ملی ہیں کہ میں بالکل خفیہ رہ کر کام کروں گا، اب تم افسروں سے مل کر جو معلومات بھی حاصل کیا کروگی، وہ بھی میں ہی تم سے وصول کیا کروں گا۔ تم سناؤ، تمہاری اپنے شوہر سے کیسی نبھ رہی ہے۔ اسے تم پر کبھی یہ شک تو نہیں ہوا کہ تم غیر ملکی جاسوسہ ہو؟''

''نہیں۔ اسے آج تک مجھ پر شک نہیں ہوسکا، تم فکر نہ کرو۔''

یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، آسمان گھومتا محسوس ہوا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نازلی اور اس کا باپ غیر ملکی جاسوس ہیں اور ہمارے ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ خدا جانے وہ اس وقت تک کس حد تک نقصان پہنچا چکے تھے۔ میں نے سُنا، اورنگ شا کہہ رہا تھا:

''اچھا، اب میں رپورٹ لینے پندرہ تاریخ کو آؤں گا، یعنی آج سے ایک ماہ بعد۔

پھر میں نے اس کے جانے کی آواز سُنی۔ میں بھی دبے پاؤں واپس اپنے کمرے میں آگیا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ چند منٹ بعد ہی نازلی بھی آکر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ میرے ہوش اڑ چکے

تھے۔ کسی کل چین نہیں آرہا تھا۔ دوسرے دن جب نازلی شام کا وقت گزارنے حویلی سے نکل گئی تو میں نے اس کی چیزوں کی تلاشی شروع کردی۔ میں نے کبھی اس کی چیزوں کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک سوٹ کیس کے نیچے ایک خفیہ خانہ ملا۔ اس میں پیغام رسانی کے آلات دیکھ کر میں دھک سے رہ گیا۔ یہی نہیں، سوٹ کیس کے اس خانے میں نازلی کے کاغذات بھی تھے۔ جن کی رو سے وہ غیر ملکی جاسوسہ ثابت ہوجاتی تھی۔ میں نے فوری طور پر ایک پروگرام بنایا۔ میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک ماہ بعد جب نازلی کا باپ اس سے ملنے کے لیے آئے، ان دونوں کو گرفتار کرادوں، لیکن اس طرح میری شہرت خاک میں مل جاتی۔ میں کہیں کا نہ رہتا، دوسرے میری بیٹی کا بھی بہت بُرا حال ہوتا۔ کوئی اس سے شادی پر تیار نہ ہوتا۔ سب یہی کہتے کہ یہ تو ایک غیر ملکی جاسوسہ کی بیٹی ہے، لہٰذا میں نے دوسرا راستہ چنا، یعنی انہیں خود نہایت خاموشی سے خاموش کردوں۔ قانون بھی ظاہر ہے، انہیں یہی سزا دیتا، چنانچہ میں نے اپنا حلیہ اورنگ شا جیسا بنایا۔ لمبے بالوں کی ایک وگ خریدی۔ منہ میں کانچ کی گولیاں رکھیں اور اسلحے کے ڈیلر سے پستول خریدا۔ پستول خریدنے کے لیے لائسنس دکھانا ضروری تھا۔ میں نے اپنے لائسنس پر روشنائی مٹانے والے سلوشن سے اپنا نام مٹایا اورنگ شا کا نام لکھ دیا۔ اس طرح پستول خریدنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ پھر نقشہ بنوایا۔ نقشہ ملازموں کو دکھایا۔ ان سے دو تین راتوں

تک کھدوائی کراتا رہا۔ جب گڑھا کافی گہرا ہوگیا تو میں نے کام بند کرادیا، پھر جس روز نازلی کے باپ کو ملاقات کے لیے آنا تھا، میں نے نازلی کے دودھ کے گلاس میں نیند کی گولیاں حل کردیں۔ وہ گہری نیند سوگئی۔ خود کو بیدار نہ رکھ سکی۔ میں کنویں کے پاس جاکر چھپ گیا اور جب اورنگ شا آیا تو اس کے سر پر وہ ڈنڈا دے مارا جو میں نے پہلے ہی ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ وہ گر گیا، پھر اس کے پیٹ پر پستول رکھ کر چلادیا اور لاش کو کنویں میں دھکیل دیا۔ تھوڑا بہت خون جو گرا، وہ بھی اس مٹی پر گرا جو کھدائی کے دوران نکالی گئی تھی۔ پھر میں نے بہت سی مٹی لاش کے اوپر ڈال دی۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک میں مٹی ڈالتا رہا۔ دوسرے دن میں نے نازلی کو بہت پریشان دیکھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ وہ تو رات کو سوئی ہی رہ گئی، حالانکہ اسے اپنے باپ سے ملنا تھا۔ چند دن تک وہ پریشان بھی رہی۔ ایک دن میں نے پھر اسے خواب آور گولیاں کھلا دیں اور بستر سے اٹھا کر کنویں پر لے گیا۔ اسے اندر پھینکا اور اسے بھی گولی مار دی۔ پستول بھی وہیں پھینکا اور وہ نقشہ بھی۔ اس کے بعد دو تین گھنٹے تک مٹی ڈالتا رہا۔ مجھے ڈر تھا تو یہ کہ ملازم کہیں پولیس کو کنویں کی کہانی نہ سنادیں، لیکن دل میں یہ اطمینان بھی تھا کہ میں نے دو ایسے آدمیوں کو مارا ہے جو ملک اور قوم کے دشمن تھے۔ خدا کی قدرت کہ ملازموں نے پولیس کے سامنے کنویں کا ذکر تک نہ کیا۔ ادھر پولیس نے بھی کنواں کھدوانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اس طرح یہ معاملہ دبا رہ گیا، لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا دوست ایاز زاوا اس

قدر ذہین ہے کہ اڑھائی سال گزرنے پر بھی میری بیوی کی گمشدگی کو نہیں بھولا۔ یہ ہے میری کل کہانی۔ اب میں آپ لوگوں کے سامنے حاضر ہوں ان لوگوں کے خلاف تحریری ثبوت میرے پاس موجود ہے اور وہ آلات بھی جن کے ذریعے پیغام رسانی کی جاتی تھی۔'' یہاں تک کہہ کر سردار تیمور خاموش ہوگئے۔ سب سوچ میں گم تھے۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

''میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا، کیونکہ میں نے آپ کی بیوی کی شام کی مصروفیات کے بارے میں پتا چلایا تھا اور مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ بڑے بڑے افسروں سے ملاقاتیں کرنے کی بہت شوقین ہے اور سردار تیمور صاحب کے پاس قتل کی کوئی اور وجہ بھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ نازلی اور اس کا باپ ضرور غیر ملکی جاسوس تھے۔ یہ اس بات سے بھی ظاہر ہورہا تھا کہ اورنگ شاہ نے خود تو حویلی بیچ کر اپنے ملک جانے کا فیصلہ کرلیا تھا، لیکن بیٹی کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا، گویا اسے اپنے افسروں کی طرف سے حکم تھا کہ صرف وہ واپس آئے اور اپنا کام اپنی بیٹی کو سونپ آئے۔ لیکن اس طرح بیٹی کو نہیں چھوڑا جاسکتا تھا، لہٰذا اس نے سردار تیمور صاحب سے اس کی شادی کردی، تاکہ اسے سوسائٹی میں ایک مقام بھی مل جائے اور وہ اپنا کام آسانی سے انجام دیتی رہی۔ اب میں یہ معاملہ محترم جج صاحب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ کیوں جناب والا، آپ کے خیال میں سردار تیمور صاحب کا جرم قابل گرفت ہے یا نہیں۔ کیا ہم انہیں گرفتار

کریں۔ یا انہیں معاف کردیا جائے۔''

جج صاحب چند لمحے تک خاموش رہے، پھر بولے:

''سردار تیمور صاحب کو قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا اگر یہ ان دونوں کو پولیس کے حوالے کردیتے تو اس سے ان کی شہرت کو ہرگز نقصان نہ پہنچتا، بلکہ ان کی نیک نامی میں تو اور بھی اضافہ ہوتا۔ لوگ کہتے، یہ وہ شخص ہے جنہوں نے اپنی بیوی کے غیر ملکی جاسوسہ ثابت ہونے پر اسے اور اس کے باپ کو پولیس کے حوالے کردیا: تاہم ان کا جرم اتنا بڑا بھی نہیں۔ انہوں نے اپنی بیوی کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا، یعنی اپنی بیٹی کی ماں کو جو آسان کام نہیں تھا۔ انہوں نے اس عورت کے ساتھ اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ گزارا تھا، لہٰذا اگر انہیں سزا دی بھی جائے تو بہت ہلکی قسم کی۔ اب چونکہ میں ریٹائر ہوچکا ہوں، میری کوئی حیثیت نہیں، اس لیے معاملہ عدالت کے سپرد کرنا ہی بہتر ہوگا، لیکن اس سے پہلے ثبوت دیکھ لیے جائیں تو بہتر ہے۔''

''جی ہاں، کیوں نہیں۔'' سردار تیمور نے مسکرا کر کہا۔

ثبوت ہر لحاظ سے مکمل پایا گیا۔ وہ واقعی جاسوس تھے، چنانچہ معاملہ عدالت کے سپرد کردیا گیا۔ گرفتاری عمل میں نہیں لائی گئی۔ یوں بھی سردار تیمور نے پہلے ہی ضمانت کرائی تھی۔

باہر نکلتے ہوئے انسپکٹر جمشید بولے:

''ہاں بھئی، اب رہ گئے تمہارے کاغذ۔ یہ لو، تم میرا کاغذ پڑھ لو، میں تمہارے۔'' انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ جیب میں

بیٹھ کر وہ کاغذ پڑھنے لگے۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے۔

''بہت خوب، تو تم تینوں اسلحے کے ڈیلر تک پہنچ گئے تھے دستخط دیکھنے کے لیے، اور وہاں جاکر جب تمہیں پتا چلا کہ رجسٹر تو میں پہلے ہی وہاں سے حاصل کرچکا ہوں تو تم سردار تیمور کے دفتر پہنچ گئے۔ وہاں سے بھی تمہیں پتا چلا کہ میں نے ان کی تحریر حاصل کرلی ہے۔ اس کے بعد تم ایاز راؤ کے دفتر بھی پہنچے، لیکن میں وہاں نہیں گیا تھا، لہٰذا تم تینوں نے ہی نتیجہ نکالا کہ مجرم سردار تیمور ہی ہیں لیکن انہوں نے یہ جرم کیوں کیا۔ یہ اندازہ تم نہیں لگا سکے: گویا تم تینوں نصف کیس حل کرسکے۔ اب میں بھی تمہیں پانچ پانچ سو روپے دوں گا۔''

''جی پانچ پانچ سو روپے۔'' فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

''ہاں بھئی، دیکھو نا، میں نے وجہ معلوم کرلی۔ اگر میں وجہ معلوم نہ کرپاتا تو پھر تمہیں ایک ایک ہزار روپے ہی ملتے۔''

''دھت تیرے کی۔ ہوگیا پانچ سو کا نقصان۔'' محمود نے جھنا کر ران پر ہاتھ مارا۔

''لاحول ولاقوۃ۔'' فرزانہ بڑبڑائی۔

''لیکن اب مجرم کا کیا بنے گا؟''

''کل پتا لگ جائے گا۔ یہ معاملہ کل ہی ختم ہوجائے گا۔''

دوسرے دن انہیں انسپکٹر جمشید نے بتایا کہ مجرم کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کے جرم میں صرف ایک لاکھ روپے جرمانہ کیا گیا تھا۔

------------☆☆☆------------

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز

مزید 30 ناول شائع ہو چکے ہیں

- [illegible]
- قلمی مہمان
- خطوط کا فریب
- گمنام ہمدرد
- سازش کا شکار
- چائے کا کپ
- کار کی تلاش
- انوکھی چال
- چال کا جواب
- ہیرا دیوی
- بوڑھا چہرہ
- حویلی کا اسرار
- ہیٹ والا
- نوٹ بک
- ریچھ نما آدمی
- پستول والا
- سیاہ فام
- ستاروں کا کھیل
- اوچھا وار
- زخمی
- آخری تصویر
- بدنصیب ہوٹل
- بھیانک روپ
- بہت بڑی بلا
- غریب ہیرے
- انشارجہ کا جاسوس
- کھردری آواز
- منصوبے کا قاتل
- موت کی مشین
- تیلاب پُل

A-36 ایسٹرن اسٹوڈیوز کمپاؤنڈ، B-16 سائٹ، کراچی
0300-2472238, 32578273, 34266800
e-mail: atlantis@cyber.net.pk
www.inspector-jamshed-series.com